ماہِ نو
اکتوبر ۱۹۵۵ء
جوش ملیح آبادی
غلام عباس
آغا محمد اشرف
قیوم نظر
ناصر کاظمی
روشن صدیقی
نسیم جعفری
انور عنایت اللہ

عوامی صنعت گری کی نمائش
ڈھاکہ

ملیریا
آپ کا جانی دشمن
اور بدترین خطرہ ہے
کیا آپ جانتے ہیں کہ اس ملک میں ہر سال ہزاروں آدمی ملیریا کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ آپ کہیں بھی ہوں اس کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ خاص کر دیہات میں سفر کرتے وقت آپ کو ہر لمحہ خطرہ ہے اس لیے ہر ممکن احتیاط اور بچاؤ کا لحاظ کیجیے خود کو اور اپنے کنبے کو "پیلوڈرین" کے ذریعہ ملیریا سے محفوظ رکھیے۔
پیلوڈرین
ملیریا سے محفوظ رکھتا ہے
ساری دنیا میں پیلوڈرین کو موثر ترین "دافع ملیریا" تسلیم کیا جاتا ہے
پیلوڈرین کا استعمال برابر جاری رکھیے
بالغوں اور ۱۲ سال سے اوپر کے بچوں کے لیے۔ ایک ٹکیہ (0.3 Gm)
۶ سے ۱۲ سال تک کے بچوں کیلئے نصف ٹکیہ
کم عمر بچوں کے لیے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کیجیے۔
ICI
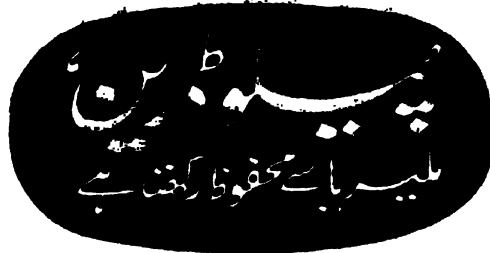
آپ کو ہر روز گندگی کے جراثیم
سے بیماری کا خطرہ
رہتا ہے
لائف بوائے سے ان جراثیم کو اپنے
جسم سے دھو کر ہر روز اپنی حفاظت
کیجئے
لائف بوائے کا
محافظ جھاگ آپکی تندرستی
کی حفاظت کرتا
ہے
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے
آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY
SOAP
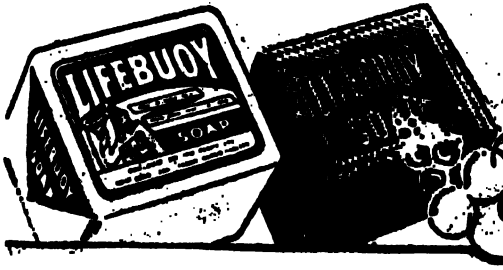
ترقی کا منصوبہ

پٹرول کیا ہوتا ہے؟ یہ بچوں کا سوال ہے اور سائنسدانوں کا بھی۔ لیکن اس جواب سے کہ یہ وہ چیز ہے جس سے کاریں چلتی ہیں بچوں کو اطمینان ہو جائے تو ہو جائے سائنسداں ہرگز مطمئن نہ ہونگے۔ ان کی ریسرچ (تحقیق) کی غایت یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں ہر سال جدید انجنوں کی کارکردگی اور ڈیزائن میں ترقی ہو رہی ہے ان کیلئے زیادہ طاقت بھی مہیا ہوتی رہے۔

(شیل کمپنی کے ادارۂ تحقیق کے کارکن ہر سال تیل کے نئے نئے استعمال اور تیل کی نئی کیمیاوی مصنوعات کے خواص دریافت کرتے رہتے ہیں تیل سے نئی ادویہ، کپڑا بنانے کے سامان، دھونے کا پاؤڈر، پینولیم لقدوں کو محفوظ رکھنے والا تیل، پلاسٹک اور دوسری لاتعداد مفید اشیاء کے ضروری اجزا حاصل کئے جاتے ہیں۔

(برما شیل کی پیشکردہ مصنوعات کو شیل کمپنی کے ادارۂ تحقیق کی پشت پناہی حاصل ہے۔ برما شیل اس طریقہ پر بھی پاکستان کی ترقی اور خوشحالی میں معاون ہے۔
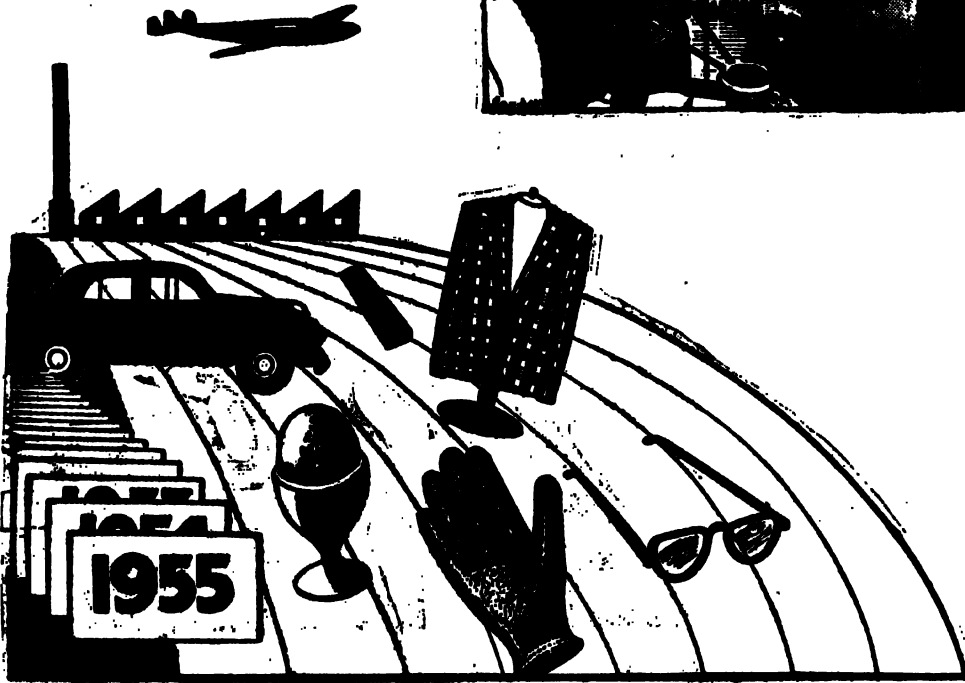
برما شیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے — پاکستان شاہراہ ترقی پر

"بالکل سفید، بالکل خالص
لکس ٹائیلٹ صابن سے میرا چہرہ صاف
و دلکش رہتا ہے"
شیلا رامانی کہتی ہے
دنیا کی حسین ترین عورتیں
اپنی جلد کی صفائی کے لئے لکس
ٹائیلٹ صابن کے استعمال پر
بھروسہ کرتی ہیں۔ اس
کا معطر و بالائی دار جھاگ
جلد کو اچھی طرح صاف
کرتا ہے اور آپ کے
رنگ و روپ کو دلکش
بناتا ہے۔
LUX
TOILET SOAP
لکس ٹائیلٹ صابن
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن
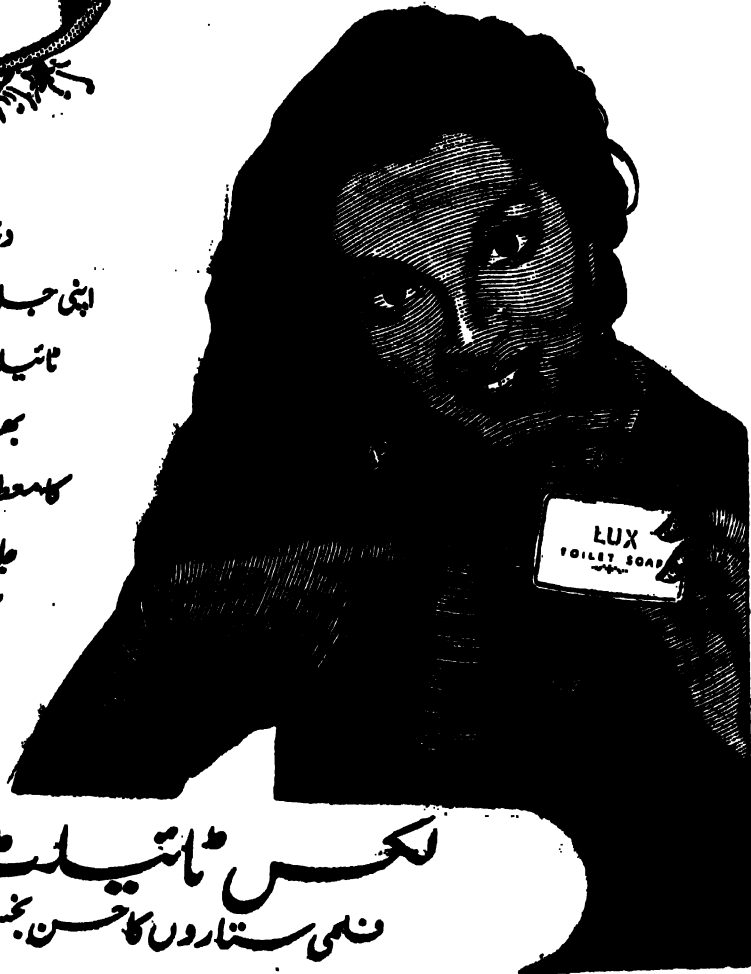
جلد ۸ شمارہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مدیر:- رفیق خاور
نائب مدیر:- ظفر قریشی

پاکستان (اور ہندوستان) میں سالانہ چندہ ۵ پانچ روپے آٹھ آنے۔ فی کاپی پاکستان (اور ہندوستان) میں آٹھ آنے

اپس کی باتیں

شہیدِ ملت لیاقت علی خاں اُس جذبہ اور ذوق وشوق کا ایک عظیم مظہر تھے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا۔ وہ ان نازک ترین لمحات میں بھی قوم کی خدمت کے لئے سینہ سپر رہے جب آزادی کی جنگ جاری تھی اور اس زمانے میں بھی پیش پیش رہے جبکہ ہماری نوزائیدہ مملکت کو اندر اور باہر دونوں طرف سے نہایت پُرآشوب حالات کا سامنا تھا۔ چنانچہ اس مردِ غازی نے، جو تمام تر جذبۂ خدمت سے سرشار تھا، اپنے وطنِ عزیز ہی کی خاطر جامِ شہادت نوش کیا اور اپنے خون کے بے بہا قطروں سے کشتِ وطن کی آبیاری کی۔ اسی لئے ہماری آنکھیں آج بھی ان کے لئے گریہ ساماں ہیں اور ہمارے دل ان کی یاد سے معمور ہیں۔ ان کی بلند شخصیت، ان کے گوناگوں اوصاف اور عظیم کارنامے اس عظیم تر ہیئت کا جزو بن گئے ہیں جسے "پاکستان" کہتے ہیں۔ اسی لئے ان کا نقش اُس نگارخانے میں ہمیشہ آویزاں رہے گا۔

ڈھاکہ میں وقتاً فوقتاً مصوری کی نمائشیں منعقد ہوتی رہی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ یہ فن وہاں شائستہ حلقوں میں روز بروز کس قدر مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ "ڈھاکہ آرٹ کونسل" کے بعد "بلبل اکاڈیمی آف فائن آرٹس" کا قیام فنونِ لطیفہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ فنون صرف خواص ہی کی ملکیت نہیں۔ عوامی آرٹ شعوری فلسفیانہ اقدار سے معرا ہونے کے باوجود ایک ادائے خاص سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ یہ درحقیقت ساری قوم کے دل و دماغ کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات عام سطح سے اُبھر کر ادب و فن میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے۔ جیسے کہ بادش بخیر بلبل چودھری مرحوم نے عوامی رقص کو نمایاں کر کے رقاصی کے فن میں جان ڈال دی تھی۔ کچھ عجب نہیں کہ عوامی فنون کی اس نمائش سے بھی ایسے ہی نتائج رونما ہوں جن کے کچھ نمونے اس شمارے میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

اردو شاعری کی نئی اصناف میں سے ایک "سانیٹ" ہے۔ دیگر نئی اصناف — "نظم آزاد"، "ڈرامائی مانولاگ" وغیرہ کی طرح اس کی ابتدا کے بارے میں کچھ اختلاف موجود ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی مرحوم کا دعویٰ تھا کہ اردو میں پہلا سانیٹ انہوں نے لکھا، لیکن ان سے پہلے کچھ سانیٹ مولوی عظمت اللہ مرحوم لکھ چکے تھے جن میں ایک فقرے کو کئی کئی مصرعوں پر پھیلانے کا التزام کیا گیا تھا، گو وہ بھی قافیہ سے آسان نہ گزر سکے۔ سانیٹ نویسی کا مستقل سلسلہ "راوی" (گورنمنٹ کالج۔ لاہور) سے شروع ہوا جس کے کسی شمارہ میں ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ، انگریزی کا ایک سانیٹ شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ ایک اور شاعر نے یوں کیا تھا ؎

فرصت لمحہ کا شش اتنی بڑھے

دن سے مہ، مہ سے سال ہو جائے (وغیرہ)

(یہ سانیٹ انگریزی سانیٹوں کی طرح ۱۴ مصرعوں پر مشتمل تھا،

ن۔ م۔ راشد اسی درسگاہ میں تعلیم پا رہے تھے جہاں سے یہ رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں انہیں "ہیئت" کے تجربات کا شوق نیا نیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سراپا ہیئت صنف کو اپنا لیا اور اس کا نام "چوکھٹ" رکھا جیسے کہ DRAMATIC MONOLOGUES کا نام "ڈرامائی واحد کلامیاں" رکھا تھا۔ اختر شیرانی بھی ہیئت کے دلدادہ تھے۔ انہیں سانیٹ بہت پسند آیا اور انہوں نے اس کثرت سے سانیٹ لکھے کہ یہ صنف انہی سے منسوب ہو کر رہ گئی۔ ایسے بعض حالات اور روایات عام طور پر نامعلوم مگر بیان کے لائق ہیں۔ جن حالات میں نئی اصناف ظہور پذیر ہوئیں ان کی وضاحت دلچسپ بھی ہوگی اور ضروری بھی ہے۔ اس شمارہ میں جناب قیوم نظر نے "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات" کے زیرِ عنوان دو نئی اصناف سانیٹ اور کینٹو کی اردو میں ترویج اور ترقی پر روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے کہ ہیئت کے دیگر تجربات بالخصوص نظم آزاد کا بھی اسی طرح محرمانہ مطالعہ کیا جائے گا اور ان کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ متعلقہ روایات کی بھی چھان بین کی جائے گی۔

ماہِ نو، کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

اردو کے غیر معروف ناول

(۴)
("جنونِ انتظار یعنی فسانۂ مرزا رسوا")

غلام عباس

ناول نگاری کی تکنیک کا ایک اسلوب یہ بھی ہے۔ کہ ناول نگار قصے میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنے اور اسے زیادہ سے زیادہ واقعیت کا رنگ دینے کے لئے ناول کے شروع میں اپنی ملاقات ہیرو، ہیروئن یا کسی اور اہم کردار سے کراتا ہے۔ اور پھر سارا قصہ اسی کی زبان سے بیان کر دیتا ہے۔ ناول لکھنے کا یہ طریق انیسویں صدی کے وسط کے یورپی اور بالخصوص فرانسیسی حقیقت پسند ناول نویسوں کو بہت مرغوب تھا۔ ہمارے ہاں اردو میں مرزا محمد ہادی رسوا کا مشہور ناول "امراؤ جان ادا" اس تکنیک کی بہت عمدہ مثال ہے۔

اس ناول کے آغاز میں مصنف کی ملاقات ایک مختصر سی مجلس مشاعرہ میں ہیروئن سے ہوتی ہے۔ دونوں لکھنؤ کے رہنے والے، موزوں طبع اور سخن فہم ہیں۔ رفتہ رفتہ ربط بڑھتا ہے اور بالآخر امراؤ جان ادا اپنی سرگزشت مرزا رسوا کو سناتی ہے۔ جسے وہ قلمبند کر لیتے ہیں۔
یہ ناول انیسویں صدی کے اواخر میں (غالباً ۱۸۹۹ء میں) لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اسی زمانے میں ایک مختصر ناول "جنونِ انتظار یعنی فسانۂ مرزا رسوا" بھی چھپا تھا۔ جس کی مصنفہ کا نام امراؤ جان ادا تھا۔ اس کتاب میں مرزا رسوا کا افسانۂ عشق بیان کیا گیا تھا۔ اور مصنفہ کا انداز تحریر، جیسا کہ اس کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے، کچھ اس قسم کا تھا۔ کہ مرزا صاحب آپ نے جو میرے حالات چھاپ کر مجھے رسوا کیا ہے۔ میں بھی آپ کا کچا چٹھا چھاپ کر اس کا بدلہ لیتی ہوں۔

ایک مدت تک میں اس کتاب کو ایک قسم کی "ادبی شوخی" ہی تصور کرتا رہا۔ میرا خیال تھا۔ کہ بیچاری امراؤ جان ادا کے خلاف، خواہ وہ ایک افسانوی کردار ہی کیوں نہ ہو، مصنف اور ناشر نے ایک طرح کی "سازش" کر کے اپنا اپنا مقصد حل کیا ہے۔ یعنی یہ کہ مرزا رسوا نے اس بہانے اپنے افسانۂ عشق کو خود الم نشرح کیا ہے اور ناشر نے کتابوں کی فروخت کے لئے اسے اشتہار بازی کا ذریعہ بنایا ہے۔

حال ہی میں "نقوش" کے "شخصیات نمبر" میں جناب علی عباس حسینی نے مرزا رسوا کے جو حالات تحریر کئے ہیں، اُن میں میری نظر جب ان الفاظ پر پڑی:-

"امراؤ جان ادا سے (مرزا رسوا کی) ملاقات بڑھی تو اُس کی زبانی زنانِ بازاری کے تجربات و طرزِ معاشرت کا خاکہ ایک ناول کی صورت میں پیش کیا۔"

تو مجھے امراؤ جان ادا کے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا۔ یہ الفاظ اس قدر واضح اور ان کے لکھنے والے ملک کے مشہور ادیب جناب حسینی ایسے ثقہ راوی ہیں کہ ادا کی شخصیت کے حقیقی ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر صاحب موصوف اس سلسلے میں مزید معلومات بہم پہنچائیں، تو مرزا رسوا کے مداحوں پر، جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے، ان کا بڑا کرم ہوگا، کیونکہ اس طرح انہیں مرزا رسوا کو، بہ حیثیت ایک فن کار اور بہ حیثیت ایک انسان زیادہ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکے گا۔

اس تمہید کے بعد اب میں اصل کتاب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں ابتدا ہی میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس کتاب کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ البتہ تاریخی اور سوانحی حیثیت سے یہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں مرزا رسوا کی زندگی کے بعض ایسے حالات مل جاتے ہیں، جو کسی تذکرے یا تاریخ ادب اردو میں نظر نہیں آتے۔ ان حالات کا تعلق مرزا رسوا کے اس عشق سے ہے، جو انہیں ایک فرنگن سے ہوا تھا۔ اور جس کا ذکر جناب علی عباس حسینی

نے بھی اپنے "نقوش" والے مضمون میں کیا ہے۔ مرزا رُسوا کی فرگمن ستوقیہ خوش قسمت ہے۔ کہ امراؤ جان آدا کی بدولت اُس پر سے گمنامی کا وہ پردہ اٹھ گیا ہے جو مرزا غالب کی ڈومنی پر ابھی تک پڑا ہوا ہے۔

"مجنونِ انتظار یعنی فسانہ مرزا رُسوا" ایک مختصر سی کتاب ہے۔ سائز ۸/۲۲×۱۸ اور صفحات کی تعداد پچیس۲۵ - اس کا تقریباً نصف حصہ نثر میں ہے۔ اور نصف مثنوی کی صورت میں۔ شروع میں مصنفہ نے ایک دلچسپ دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں وہ کہتی ہیں:۔

"ناظرین! مرزا رُسوا صاحب نے جو میری سرگزشت تحریر کی ہے، وہ غالباً آپ کی نظر سے گزری ہو گی۔ خیر یہ میں اب نہیں کہتی کہ اچھا کیا یا بُرا۔ مگر پہلے سے اس کا اقرار نہ تھا۔ اس لئے کسی قدر ملال ہوا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری آوارگی کا افسانہ چھاپ کر شائع کیا جائے گا تو شاید میں ہرگز اس کے بیان کرنے پر راضی نہ ہوتی۔ واقعی مرزا صاحب کا چکمہ چل گیا۔ لطف یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں نے تجھ پر احسان کیا۔ اگر درحقیقت یہ احسان ہے۔ تو میں بھی ان کے ساتھ اس کا عوض کرتی ہوں ؎

دُشنام دیجے مجھ کو بہت خوش نہ ہو جئے
کیا کیجئے گا آپ جو میری زباں کھُلی

جب سے آپ نے میری سوانح عمری کے شائع کرنے کا قصد کیا۔ مجھے بھی کد ہو گئی تھی۔ کہ آپ کے بعض اسرار سے دنیا کو واقف کراوں۔ اس کے لئے مجھے خاص اہتمام کرنا پڑا۔ آپ کا ایک ملازم خاص جس کے نام و نشان سے میں مطلع نہیں کر سکتی مجھ سے موافق ہو گیا۔ ایک دن آپ ایک دوست کے گھر پر مشاعرہ میں تشریف رکھتے تھے۔ بندی نے فوراً گاڑی کرایہ کی۔ اور آپ کی کوٹھی پہنچی۔ آپ کا آدمی جو مجھ سے مل گیا تھا اس نے چپہ چپہ مجھے دکھا دیا۔ اسی آدمی کے ذریعے سے آپ کی ایک کتاب جس میں ایک تصویر اور بہت سے خطوط اور ایک ناتمام مثنوی "نالہ رُسوا" میرے ہاتھ آ گئی۔ کچھ حالات بعض دوستوں سے معلوم ہوئے۔ غرض کہ ان سب واقعات کو میں نے بطور خود لکھ کے چھپوا لیا جس دن مرزا صاحب نے میری سوانح عمری شائع کی۔ اور ایک جلد میرے ملاحظہ کے لئے بھیجی، اسی دن میں نے اس مختصر تحریر کی ایک جلد ان کی خدمت میں روانہ کی یقیناً مرزا صاحب خوش تو ہوئے ہوں گے مگر کیا کر سکتے ہیں۔

فدویہ

یکم اپریل ۱۸۹۹ء
امراؤ جان آدا"

اب میں اختصار کے ساتھ مگر قصے کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے "مجنونِ انتظار" کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

مرزا رُسوا صاحب کی وجاہت اور طلاقتِ لسانی میں غضب کی دلآویزی ہے جس محفل میں بیٹھ جاتے ہیں عورت مرد سب ان ہی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ روتے آدمی کو ہنسا دینا ان کی ایک ادنیٰ بات ہے۔ خدا کی دی ہوئی ذہانت پر طرّہ علمیت اور تجربہ کاری۔ ان اوصاف نے ان کے جوہر ذاتی کو اور جلا دیدی ہے۔ طبیعت کی موزونی، شوقِ شعر و سخن کو حسن پرستی کے مذاق نے چمکا دیا ہے۔ ان سب اوصاف کے ساتھ مزاج میں کسی قدر سنک ہے۔ بعض طبیبوں کی یہ رائے ہے کہ دشمنوں کو جنون کے دورے پڑتے ہیں۔ کسی کو یہ خیال ہے۔ کہ آپ کو پریوں کی تسخیر کا شوق ہے غرضکہ کچھ نہ کچھ اسرار ضرور ہے۔

آپ جہاں رہتے ہیں اس کو وحشت آباد کہنا چاہیئے۔ لکھنؤ سے دو کوس کے فاصلے پر اس سڑک کے قریب جو لوہے کے پل سے نواب گنج کو جاتی ہے۔ ایک باغ کی مختصر چار دیواری نظر آتی ہے۔ اس کے چاروں طرف کوسوں تک میدان ہے۔ کہیں آبادی کا نام و نشان نہیں۔ یہاں آپ مع دو تین ملازموں کے رہتے ہیں۔ اس باغ کے وسط میں ایک چھوٹی سی کوٹھی بہت خوشنما بنی ہوئی ہے۔ کوٹھی کے سامنے تھوڑی دور پر ایک پختہ گول چبوترا ہے۔ اس کے گرد چمن بندی ہے۔ گرمیوں کے زمانے میں یہاں بڑی خنکی ہوتی ہے۔ کیونکہ کئی سقے متواتر پانی چھڑکا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب دوپہر کو اکثر یہیں تشریف

رکھتے ہیں۔ فکرِ اشعار کے لئے یہ مقام بہت ہی مناسب ہے۔ کوٹھی اندر سے خوب سجی ہوئی ہے۔ اس کے ایک کمرے میں مرزا صاحب خود آرام کرتے ہیں۔ باقی اور کمرے مقفل رہتے ہیں۔

کوٹھی کے سامنے ایک چھوٹا سا چھپر پڑا ہے۔ اس کے چاروں طرف لوہے کے تاروں کی جالی ہے۔ اس میں طرح طرح کے آلات نصب ہیں۔ آدمی کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کے دیکھنے سے گرمی، سردی، آندھی مینہ زلزلے وغیرہ کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ باغ کے ایک طرف مجھ کو ایک پختہ بہت گہری باؤلی دکھائی گئی۔ اس پر لوہے کے ستونوں سے ایک بہت اونچا برج بنا ہوا ہے۔ اس باؤلی اور برج میں نیچے سے اوپر تک اندھیر اگھپ ہے۔ دن کو لالٹین جلا کے جانا ہوتا ہے۔ برج کی چھت میں جا بجا سوراخ ہیں۔ ان سوراخوں میں سے دن کو ستارے نظر آتے ہیں۔ اس باؤلی کے قریب ایک چھوٹی سی پختہ کوٹھری ہے اس میں کئی بڑی بڑی دوربینیں، دو کرے اور کچھ اور سامان رکھا ہوا ہے جسے میں نہیں سمجھ سکتی۔ مثنوی "نالۂ رسوا" میں مرزا صاحب ان صاحب کے حال میں جن کی یہ کوٹھی اور باغ ہے۔ اس طرح تحریر فرماتے ہیں :-

ایک صاحب تھے پہلے اس میں مقیم　　　صاحبِ علم اور عقیل و فہیم
شوق تھا ان کو علم و حکمت سے　　　ذوق تھا نکتہ ہائے فطرت سے
ایک لڑکی تھی اُن کی حور لقا　　　حسن میں مہر و ماہ سے بھی سوا
کیا کہوں تجھ سے کیسی صورت تھی　　　لے یہ تصویر ایسی صورت تھی

یہ تصویر خوش قسمتی سے ہمیں مل گئی تھی۔ مگر مرزا رسوا صاحب نے باصرار ہم سے واپس لے لی۔ ورنہ اس کی نقل ہم ضرور ہی شائع کرتے۔

لب و لہجہ میں اس کے سوا اعجاز　　　برق سے بڑھ کے شعلۂ آواز
اس پہ طرہ کمالِ موسیقی　　　دل سے محوِ خیالِ موسیقی
کسی اُستاد کی سکھائی ہوئی　　　دلِ کافر میں نے سمائی ہوئی
ان کے دادا کا تھا فرانس وطن　　　اور نانا تھے ساکنِ لندن
ہوئے ماں باپ ہند میں پیدا　　　دل سے اس سرزمیں کے تھے شیدا
لکھنؤ میں یہ خود ہوئیں پیدا　　　تھا یہی شہر جائے نشو و نما
ان کی دایا بھی لکھنؤ کی تھیں　　　ان کی آیا بھی لکھنؤ کی تھیں

بولتی تھیں زبانِ اردو صاف　　　کس قدر با محاورہ شفاف
لکنت ان کی زباں میں ہو کیا دخل　　　گنجلک ان کے بیاں میں ہو کیا دخل

مرزا رسوا اپنے اور مس صاحبہ کے تعلقات کے وجوہ اس طرح تحریر کرتے ہیں :

میرے عمو ہی نامدار وغیور　　　جو کہ ہیں سارے شہر میں مشہور
فوج شاہی میں تھے کماں افسر　　　ان کے احساں تھے ان کے والد پر
غدر میں اپنے گھر میں کر کے نہاں　　　دشمنوں سے بچائی ان کی جاں
گو کہ وہ معرضِ خطر میں رہے　　　مگر آرام سے یہ گھر میں رہے
عورتوں میں بڑھی ملنساری　　　مدتوں تک یہ رسم تھا جاری
میم صاحب کبھی یہاں آئیں　　　کبھی میری چچی وہاں جائیں
آدمی روز آتے جاتے تھے　　　حصے بخرے بھی جاتے آتے تھے
یہ سوتیاں پکا کے بھیجتی تھیں　　　عید گھر میں منا کے بھیجتی تھیں
باغ سے اُن کے پھول آتے تھے　　　ان کی بیری کے بیر جاتے تھے

مرزا رسوا اور مس صاحبہ آپس میں کھیلا کرتے تھے۔ بچپنے ہی میں محبت دلوں میں اثر کر گئی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کو مرزا صاحب نے اس طرح موزوں کیا ہے :

جس زمانے میں تھا یہ رسم و راہ　　　جن دنوں تھا یہ چاہتوں کا نباہ
سوفیہ سے ہوئی مجھے الفت　　　بڑھ گئی رفتہ رفتہ کچھ وحشت
بڑھ گیا ارتباط حد سے سوا　　　ہو گیا اختلاط حد سے سوا
دلِ نازک کا خون ہو ہی گیا　　　رفتہ رفتہ جنون ہو ہی گیا

مگر یہ محبت یک طرفہ نہ تھی بلکہ :

بسکہ یہ ربط جانبین سے تھا　　　کل اسے تھی نہ میں ہی چین سے تھا
عشق صادق تھا پاک الفت تھی　　　مجھ سے بڑھ کر اسے محبت تھی

اس کے بعد ان دونوں خاندانوں پر تباہی آئی۔ مرزا رسوا کے چچا نے انتقال کیا۔ اور اس کے چند ہی روز کے بعد چچی بھی مر گئیں۔ اور ادھر

اسی اثنا میں مر گئے صاحب　　　اس جہاں سے گزر گئے صاحب
میم صاحب بھی کر چکی تھیں قضا　　　سوفیہ گھر میں ہو گئی تنہا

مگر مرزا رسوا ماتم پرسی تک کو نہ جا سکے۔ اس لئے کہ سوفیہ کو اب صاحب کے ایک عزیز نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ وہ مرزا رسوا اور ان کے خاندان کے رسم و راہ سے مطلع نہ تھا۔ دوسرے اختلاف قوم و مذہب۔ ان خیالات نے ان کو روکا۔

گو کہ یارائے ضبط مجھ کو نہ تھا　　مگر ایسا بھی خبط مجھ کو نہ تھا
کہ مری وجہ سے وہ ہو بدنام　　ایسی باتوں کا تھا بُرا انجام

مس صاحبہ کو ان کے عزیز نے پہاڑ پر بھیج دیا۔ اور جائداد موروثی کورٹ ہو گئی۔ اس زمانے میں جو کچھ مرزا رُسوا کے دل پر گزری اس کا حال سوا اُن کے یا خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ نالہ و زاری، بے قراری راتوں کا جاگنا، ستارے گننا، دن بھر منہ لپیٹے پڑے رہنا۔ بھوک کا جاتا رہنا، چہرہ کا زرد اور لبوں کا خشک ہو جانا، چپکے چپکے دل سے باتیں کرنا، ہم نشینوں کی صحبت سے نفرت، ویرانوں کی سیر، عاشقانہ اشعار پڑھنا یا خود موزوں کرنا مگر ان باتوں سے دل کی اصلی حالت کا بیان بہت دشوار ہے۔

چچا کے مرنے کے بعد ان کی کل جائیداد پر ان کی چچا زاد بہن قابض ہو گئی تھیں۔ چچا نے اپنی زندگی میں چاہا تھا کہ اپنی لڑکی کے ساتھ (جو اب جائداد پر قابض ہوئیں) نکاح کر دیں مگر آپ نے نہیں معلوم کس وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ سوفیہ کی محبت ہو۔ مگر اس کا حال ٹھیک معلوم نہیں۔ اتنا جانتے ہیں کہ چچا زاد بھائی بہنوں میں چچا کی زندگی تک ملاپ رہا مگر جب سے ان کی شادی ہو گئی، وہ محبت بالکل عداوت سے بدل گئی۔ ان کو سب سے بڑھ کے مشکل یہ ہوئی کہ اب رہنے کا ٹھکانہ تک نہ رہا۔ اگرچہ مکان موروثی تھا مگر ان کے والد محجوب تھے۔ اس لئے ان کا کوئی حق اس میں نہ تھا۔ اس زمانہ میں ان کی ایک کھلائی بوا گل چہرہ انکے کام آئیں۔ انہیں، کے پاس یہ رہنے لگے۔ اسکول میں نام لکھوا لیا۔ انگریزی پڑھنا شروع کیا۔

ان کو مدرسہ میں پڑھتے کوئی چھ سات برس گزرے ہوں گے۔ کہ مس صاحبہ کا علاقہ اور جائداد کورٹ سے چھوٹا۔ اور وہ لکھنؤ میں آکر اپنی کوٹھی میں رہنے لگیں۔ مگر نہیں معلوم ان کو کیا ہو گیا تھا کہ نہ جانا تھا نہ گئے۔ اسی زمانہ میں یہ خط ان کو ملا جس کا ترجمہ لفظ بلفظ یہاں لکھا جاتا ہے:۔

"میرے پیارے دوست۔ واقعی تم بڑے بے مروت ہو۔ ہم پر کیا کیا آفتیں گزر گئیں۔ اور تم نے خبر نہ لی۔ ماں باپ دونوں قضا کر گئے۔ ہم شہر سے کالے کوسوں دور بھیج دئے گئے۔ برسوں گویا قید ہی رہے۔ تم کو ان باتوں کی خبر ضرور رہتی ہو گی۔ مگر افسوس ہے کہ تم نے ایک پرچہ خط بھی کبھی نہ لکھا۔

مجھ کو تمہارا پتہ معلوم نہ تھا نہیں تو میری طرف سے پہل ہوتی۔ اب آیا کی لڑکی سے جس کا میاں مارٹینیز کالج میں نوکر ہے معلوم ہوا کہ تم وہاں پڑھتے ہو۔ اسی پتے سے تم کو خط لکھا ہے۔ جلد جواب لکھو۔ بلکہ خود آؤ۔ اگر تم میں کچھ بھی انسانیت اور وفاداری کا شائبہ ہو تو ہم سے ضرور ملو۔ ہم اسی قدیم کوٹھی میں رہتے ہیں۔ جہاں لڑکپن کے دنوں میں کھیلا کرتے تھے۔ وہ درخت اب تک موجود ہیں۔ جن پر ہم چڑھ کے چڑیوں کے گھونسلے اُجاڑا کرتے تھے۔ وہ حوض ابھی باقی ہے جس میں گھنٹوں چھپاک چھپیا ہوتی تھی۔ وہ تمہارا ایک دن روٹھ جانا اور کھجور کے درخت کے نیچے مچل کے بیٹھ جانا اور پھر اُٹھ کے کوٹھی میں چلا جانا آج تک آنکھوں میں پھرتا ہے۔

بعض امور کا جو تمہیں خیال ہے، اس کو دل سے دور کرو۔ دوستی میں ایسی نازک خیالیوں سے کام نہیں چلتا۔ کیا تم مجھ کو انسان نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے تمہاری بدگمانی پر افسوس ہے اور تمہیں مجھ سے معافی مانگنا چاہئے۔ مگر میں تم سے خود معافی مانگتی ہوں کہ میں نے یہ دو تین گلے کیوں لکھے۔ ممکن ہے تم کسی اور وجہ سے نہ آئے ہو۔ بہر طور اب آؤ اور جلد آؤ۔ مجھے تم سے ایک اور ضروری کام ہے جس کا اظہار اس خط میں مناسب نہیں۔

تمہاری لڑکپن کی دوست

سوفیہ"

اس خط کے آنے کا حال مرزا نے اپنی مثنوی نالہ رسوا میں جس جوش مسرت کے ساتھ تحریر کیا ہے واقعی اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ابتدا ایک ساقی نامہ سے کی ہے:۔

بادۂ مشکبار لا ساقی　　میں ہوں اور تو بلا ساقی
اب نہیں تابِ انتظار مجھے　　بھر کے دے جام خوشگوار مجھے
آسماں مجھ کو دے مبارکباد　　کہ ہوا قیدِ غم سے میں آزاد
قاصدِ شوق حرزِ جاں لایا　　نامۂ یارِ مہرباں لایا

میں ہوں اب اور آستانِ حبیب   نہ غمِ پاسباں نہ خوفِ رقیب
خانۂ دل سے کلفتیں نکلیں   حسبِ دلخواہ حسرتیں نکلیں
آج گویا کہ ہے برات کی رات   اور ہے انتظار رات کی رات
مژدہ اے دل کہ عید کا دن ہے   مژدہ اے چشمِ دید کا دن ہے

غرضکہ وہ رات پہاڑ ہوگئی مگر

دل سے حیلے ہزار ہا کر کے   رات کاٹی خدا خدا کر کے
صبح ہوتے ہی اپنے بستر سے   ہاتھ منہ دھو کے ہم چلے گھر سے
عازمِ کوئے گلعذار ہوئے   جا کے اس شوخ سے دوچار ہوئے

مس صاحبہ دوستانہ طور پر ملیں، میٹھی میٹھی باتیں کیں، گلے شکوے ہوئے اور

ہم کو ہونا تھا شرمسار آخر   ہمیں ٹھہرے گناہگار آخر
کیوں نہ آئے یہ ان سے کیا کہتے   نہ بنا کچھ بجز "بجا" کہتے

اس کے بعد مطلب کی باتیں شروع ہوئیں :-

پھر وہ کہنے لگی کہ اے رسوا   تم سے اک مدعا بھی ہے میرا
نفعِ ذاتی یہ ہے نظر سب کی   سچ ہے دنیا ہے اپنے مطلب کی
بات یہ ہے کہ میں ہوں عورت ذات   اور علاقہ کی فکر ہے دن رات
میرے لائق یہ کاروبار نہیں   غیر کا مجھ کو اعتبار نہیں
اپنے ذمے یہ کام لو مجھ سے   اختیاراتِ عام لو مجھ سے
نوکری کا نہ سلسلہ سمجھو   اس کو اپنا معاملہ سمجھو
سُن کے اس مہ لقا کی یہ گفتار   چاہتا تھا کہ میں کروں انکار
کہہ رہا تھا اُدھر دلِ گمراہ   ماننا ہی پڑے گا خواہ مخواہ
دل طرفدار ہو گیا اس کا   مدعی یار ہو گیا اس کا

خلاصہ یہ کہ مرزا رسوا کے نام مختار نامہ ہو گیا۔ چند روز لکھنؤ میں رہ کے پھر علاقہ پر گئے۔ یہاں ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کو بڑی دقتیں پیش آئیں، مگر دل میں جس بات کا ارادہ اور شوق ہوتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آتی ہے۔ مرزا صاحب کا نوکر نوروز علی کسانی کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ لکھنؤ سے اُسے بلوا کے ضلع دار مقرر کیا۔ اس نے قرار واقعی بندوبست کیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی واقف کار ہو گئے۔ کام چلنے لگا۔ کئی سال تک یہی حال رہا۔

مرزا رسوا اور مس صوفیہ کے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے انگریز منگیتروں کے سُنے جاتے ہیں۔ انگوٹھیاں بدل گئی تھیں۔ بیاہ اور نباہ کے اقرار ہو چکے تھے۔ ظاہر میں بالکل انداز عاشقی معشوقی بلکہ میاں بیوی کا تھا۔ دونوں میں پاک بازی تھی۔ آتشِ شوق کے شعلے بلند تھے۔ دونوں بے تاب، دونوں بے قرار، صبر کا امتحان، ضبط کی آزمائش۔

اس اثنا میں مس صاحبہ نے بمبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مرزا صاحب نے ساتھ چلنے کے لئے ضد کی۔ آخر انہیں بھی ہمراہ لیا۔ دونوں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوئے۔ وہاں جا کے ہوٹل کے دو کمرے کرائے پر لئے۔ بمبئی کی خوب سیریں ہوئیں۔ صبح سے شام تک گشت کرنا، راتوں کو تھیٹروں میں جانا۔ غرض کہ ایک ہفتہ تک خوب جشن کیا۔ ایک دن سرِ شام سے مس صاحبہ نے کہا۔ میرے سر میں درد ہے آج میں تماشہ میں نہ جاؤں گی۔ کھانے والے سے فراغت کر کے نو بجے سونے کے کمرے میں چلی گئیں۔ مرزا رسوا بھی اپنی جگہ سو رہے۔

صبح کے وقت دونوں ایک ہی ساتھ چائے پیا کرتے تھے۔ آج معمول سے زیادہ دیر ہوگئی مس صاحبہ نہ برآمد ہوئیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مرزا رسوا نے انتظار کیا۔ پھر جا کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی آواز نہ آئی تو آخر دروازہ کھولا اندر گئے۔ دیکھا مس صاحبہ ندارد ہیں۔ کمرہ خالی پڑا ہے۔ مرزا رسوا کی آنکھوں میں اندھیرا سا آگیا۔ ہوٹل کے نوکروں سے پوچھا معلوم ہوا مس صاحبہ نے رات کو گیارہ بجے گاڑی مانگی تھی سوار ہو کے کہیں گئیں۔

اب تو مرزا رسوا صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ کیوں گئیں کہاں گئیں۔ اسی شش و پنج میں تھے کہ لکھنے کی میز پر ایک لفافہ مس صاحبہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے نام کا ملا۔ جلدی جلدی لفافہ کھولا۔ لکھا تھا :

میرے پیارے تم میرے دفعتہً بے اطلاع غائب ہو جانے سے ملول نہ ہونا۔ بات یہ ہے کہ بمبئی میں میں صرف سیر و سیاحت کے لئے نہیں آئی تھی ایک خاص مطلب تھا۔ مگر اس کا اظہار تم سے مناسب نہ تھا۔ مجھے لکھنؤ میں معلوم ہوا تھا کہ میری پھوپی جو پیرس میں رہتی تھیں کروڑوں کی جائداد چھوڑ کے انتقال کر گئیں۔ سوا میرے ان کا کوئی وارث نہیں ہے۔ ان کے مختار کے خط سے معلوم ہوا کہ وصیت نامہ بھی میرے نام کا کر گئی ہیں، مگر اس کے لئے مجھ کو پیرس جانا ضرور ہے۔

میں تمہیں اپنا شوہر اور لکھنؤ کو اپنا وطن سمجھتی ہوں۔ مگر اس معاملے کے لئے میرا جانا ضروری تھا تم کو ساتھ نہ لانے میں یہ مصلحت تھی کہ ولایت کے لوگ جن میں اکثر میرے دور کے رشتہ کے عزیز بھی ہیں

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربات

(سانیٹ اور کینٹو)

قیوم نظر

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جہاں ملک میں معاشی، سیاسی اور سماجی ہر قسم کی تبدیلیاں نظر آنے لگیں وہاں اُردو شاعری نے بھی ایک کروٹ لی۔ اگرچہ یہ کروٹ وضاحت کے ساتھ انیسویں صدی کے آخر بلکہ بیسویں صدی کے آغاز میں نظر آئی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو شاعری کو جدید راستوں پر چلانے کی شعوری کوششیں ۱۸۶۷ء سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ یہ وہ سال ہے جب مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے چند انگریزی نظموں کا اُردو نظم میں ترجمہ شائع کیا۔ اسی سال مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ایک لیکچر کی صورت میں اپنے اس کام کی بنیاد رکھی، جس کو انہوں نے بعد میں حالی کی اعانت اور کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں انجام تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اگرچہ حالی اور آزاد کی مثنویاں، بعد میں حالی کے اپنے دیوان کا مقدمہ، اس بیمار شاعری سے نجات دلانے کا شدید اظہار تھا جس کے شکنجے میں بعض شعراء پھنسے ہوئے تھے تاہم اس کی گرفت اس قدر مستحکم تھی کہ ابھی بات بنائے نہ بنتی تھی۔

اُردو شاعری کا کثیر سرمایہ غزل کی صورت میں ملتا ہے۔ بلکہ جتنی غزلیں اُردو میں لکھی گئی ہیں کسی دوسری زبان میں شاید اس قدر اس کا تمام شعری سرمایہ بھی نہ ہو۔ پھر بھی غزل کی محدود وسعت آج بھی ایسی نہیں کہ اس میں کوئی بڑا شاعر اپنی تمام کائنات خاطر خواہ طور پر پیش کر سکے اور شاید یہی باعث تھا کہ غالب ایسے قادر الکلام شاعر کو بھی ایک صدی پہلے یہ کہنا پڑا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

جب سر سیّد اور ان کے رفقاء نے ادب کی پرانی اقدار کو بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر بدلنا چاہا۔ تو سب سے زیادہ جو صنفِ ادب معرضِ بقا میں آئی یا نئے تقاضوں کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنی وہ غزل تھی۔ چنانچہ جب غزل کی چھان پھٹک ایک نئے انداز سے کی گئی تو اکثر ذہین شعرا کو اس کی تنگ دامانی کا شدید احساس ہوا۔ اس تنگ دامانی میں اس کی ہیئت اور روایات کو خاصا دخل تھا۔ غرض بیسویں صدی کے ربعِ اول کے آخر تک اگر ایک طرف غزل معتوب رہی تو اس کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعری سے اُردو شاعری صراحتاً متاثر بھی ہوتی رہی۔ اس ضمن میں اقبال کی کوششیں نہایت کارگر ثابت ہوئیں۔ جن کے سائے میں جوش ملیح آبادی اور ابو الاثر حفیظ ایسے شعرا بھی اپنے افکار کو نت نئے سانچوں میں ڈھالتے رہے۔ یہ دور کلاسکیت سے بغاوت اور رومانیت کی آغوش میں پناہ لینے کا دور تھا۔ چنانچہ اس دور میں شعراء کو اپنی اس انفرادیت کی تلاش تھی، جس کو ان کے آباء نے قواعد و ضوابط کی پابندی، الفاظ کی تراش خراش، صنائع بدائع اور خارجی شوخی و طرحداری کے پردوں میں گم کر دیا تھا۔ اسی انفرادیت کو پانے کی لگن نے بعض من چلے شعراء کو نئے راستے سجھائے اور اگر ایک طرف عظمت اللہ ایسے نکتہ سنجوں نے اردو شاعری کے سینے کو ہیئت کے بعض تجربوں کی ضیا سے منور کرنا چاہا تو بعض ذہین نوجوانوں نے اس ضمن میں شمع دشعر فرنگ سے مستعار روشنی حاصل کرنے کو مستحسن خیال کیا۔ اس سلسلے میں کئی شعرا کے نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن ن۔ م راشد اور اختر شیرانی کے نام شاعری میں ہیئت کی ایک خاص صنف سے بالخصوص منسلک ہیں۔ ن م راشد کا ذکر تو نظمِ آزاد کے علمبرداروں میں بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے، لیکن جب یہ نام اختر شیرانی کے ساتھ آتا ہے تو دھیان ہیئت کے سلسلے میں اُردو میں سانیٹ کے آغاز کی طرف جاتا ہے۔

ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے کہنے کے مطابق اردو میں نظم آزاد کا آغاز خود انہوں نے کیا لیکن اتفاق سے ان کی کہی ہوئی آزاد نظمیں جب چھپیں کہ ن۔م راشد کی آزاد نظمیں چھپ کر لوگوں تک پہونچ چکی تھیں۔ اور اس طرح نظم آزاد کا بانی ن۔م راشد شمار کیا جانے لگا۔ اسی طرح ایک بیان کے مطابق اردو میں پہلا سانیٹ اگرچہ ن۔م راشد نے لکھا لیکن جو سانیٹ عوام کے سامنے شائع شدہ صورت میں آیا وہ اختر شیرانی کا تھا۔ اور یوں اُردو میں سانیٹ کے آغاز کا سہرا اختر شیرانی کے سر بندھا۔

دنیائے شعر میں سانیٹ کی ابتدا پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نظم کی یہ مخصوص شکل ردیف وقافیہ کے چند در چند تجربات کے بعد ظہور میں آئی۔ اطالوی زبان میں ان گنت گائی جانے والی چھوٹی چھوٹی نظموں نے اسے ایک مستقل صورت دی اور اس میں چودہ اور صرف چودہ مصرعوں کا ہونا ضروری قرار پایا۔ یہ چودہ مصرعے بھی دو بندوں کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ پہلے بند میں آٹھ مصرعوں کا ہونا اور دوسرے بند کا چھ مصرعوں سے ترتیب پانا ضروری قرار دیا گیا۔ چونکہ یہ ایک شدید قسم کی پابند صنفِ سخن تھی۔ اسی لئے پہلے آٹھ مصرعوں میں ردیف وقافیہ کا بھی اس ترتیب سے آنا لازمی گردانا گیا۔

الف ب ب الف الف ب ب الف

لیکن دوسرے بند یعنی اگلے چھ مصرعوں میں اس ترتیب کا ہونا چنداں ضروری نہ تھا۔ زیادہ وضاحت کے لئے اختر شیرانی کے ایک سانیٹ کا پہلا بند سنئے۔ جس میں ردیف وقافیے کی یہی ترتیب ملتی ہے:۔

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارا ہے
تو اس منسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اطالوی میں یہ صنف پیٹرارک اور دانتے کے ہاتھوں نہایت خوش اسلوبی سے پنپی۔ انگریزی میں پہلے پہل وائٹ نے ترجمے کی صورت میں اس کو پیش کیا اور پھر سانیٹ کہنے کا شوق اس قدر بڑھا کہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر تک ہر چھوٹا بڑا شاعر اس صنف میں اپنے خیالات کا اظہار ضروری شمار کرنے لگا۔ لیکن ابتدائی دور میں انگلستان میں ردیف وقافیہ کی جو صورت ظہور میں آئی وہ یوں تھی:

الف، ب، الف ب، ج د، ج د

یہ آٹھ مصرعوں کا پہلا بند تھا اور دوسرا بند رس رس ص ص کی صورت میں رہا۔ مثال کے لئے معین احسن جذبی کا ایک سانیٹ، جس کا عنوان "طوائف" ہے، سنئے۔ اگرچہ اس میں اُس ردیف وقافیہ کے التزام سے کسی قدر انحراف کیا گیا ہے جس کا ابھی ذکر آیا ہے لیکن یہ انحراف شاید اسی صنف کے جدید تر تقاضوں کے باعث ہے:

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو
تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگیٔ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار رہیں شبنم کے تلون سے مگر
تو نے اس دیدۂ پرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو
اور یہ زرد سے رخسار یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار مری عرضِ وفا سے بیزار

سترھویں صدی عیسوی کے آغاز تک ملکہ الزبتھ کے عہد میں علوم وفنون نے ترقی کی تو سانیٹ بھی شیکسپیئر ایسے نابغوں کے ہاتھوں بڑھتی چڑھتی رہی۔ بعد میں ملٹن اور ورڈزورتھ ایسے شعرا نے اس ردیف وقافیہ کے التزام میں اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق تبدیلیاں کیں، جو انہی کے نام سے منسوب ہیں۔ اگرچہ اٹھارویں صدی کے اختتام پر سانیٹ پر بُرا وقت بھی آیا اور اس سے عوام کی وابستگی

کم سے کم تر ہوتی گئی مگر یہ دَور عارضی سا تھا اور شعرا نے انیسویں صدی میں اس کو پھر سنبھالا دیا اور انگریزی ادب میں یہ صنف آج تک نامقبول نہیں ہے۔

انگریزی میں سانیٹ کی اس نہری شستی تاریخ کے بعد ہم اردو میں سانیٹ کی طرف پھر چلتے ہیں۔ اختر شیرانی نے رومانی شاعری کو جس نہج پر چلایا۔ اس سے نہ عوام میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور اسکے انداز اور بیان کی مقبولیت نے ایک وبا کی سی صورت اختیار کرلی جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سانیٹ لکھنا، اور اختر شیرانی کی تقلید میں لکھنا فیشن میں داخل ہوگیا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے چند برس بعد تک اردو میں بے شمار سانیٹ معرضِ وجود میں آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج ان میں سے صرف چند ہی کا نشان تابش صدیقی ایسے شعرا کے ہاں ملتا ہے۔

اگرچہ ابتدا میں اختر اور راشد نے سانیٹ میں ردیف و قافیہ کا نہ ہی التزام رکھا جو اطالوی سانیٹ کا تھا لیکن بعد میں اختر کی متلون طبیعت نے اس میں کچھ ترامیم بھی کیں جن کی نقل دوسرے شعرا سے نہ ہو سکی۔ مثال کے طور پر اس کا یہ سانیٹ دیکھئے جس میں اگر ایک طرف ردیف و قافیہ کا التزام مثنوی کے انداز پر رکھا ہوا ہے۔ تو دوسری طرف مستزاد نما ایک ٹکڑا بھی ہر مصرع کے ساتھ چپکا ہوا ہے جو مستزاد ہی کے مانند اپنے پہلے مصرع کے ساتھ ہم قافیہ بھی ہے اور سانیٹ کو ایک اعتبار سے مستزاد کا قالب دئے ہوئے ہے۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔

سانیٹ سنئے، عنوان ہے "تیتری"

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگ پریدہ ہے — بوئے چکیدہ ہے
آغوشِ گل میں یا کوئی نقشِ دمیدہ ہے — عکسِ کشیدہ ہے
اٹھے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے — پاشیدہ سامنے
بیٹھے تو ایک لذتِ خوابیدہ سامنے — دامن کشیدہ ہے
جوئے صبا میں ہلکا سا طوفانِ رنگ و بو — ہیجانِ رنگ و بو
دوشِ فضا پہ چھوٹا سا نیسانِ رنگ و بو — جوصف کشیدہ ہے
اک پُر بہار نقش ہے عشرت کے خواب کا — عہدِ شباب کا
یا برگِ گل پہ لرزشِ جامِ شراب کا — عکسِ رمیدہ ہے
ہلکی سی اک شعاع ہے طورِ کلیم پر — سطحِ نسیم پر
رقاصۂ بہار کا فرشِ شمیم پر — رقصِ پریدہ ہے
ابھرا ہوا سا عکس ہے رنگیں غبار کا — کیف و خمار کا
یا شاخسارِ گل پہ عروسِ بہار کا ٥ — حسنِ دمیدہ ہے

اک نوعروس کی نگہِ انفعال ہے — شرم و ملال ہے
یا اک شعاع پر توِ قوسِ ہلال ہے — اور نو دمیدہ ہے

اس سانیٹ میں، جو اپنی صنف میں ایک نادر تجربہ ہے، دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک بات اور بھی ملتی ہے اور یہ وہی روایت سے بغاوت کا اعلان ہے۔ سانیٹ کے لئے اب تک یہ ضروری تھا کہ اس کا پہلا بند آٹھ اور دوسرا چھ مصرعوں کا ہو لیکن اختر شیرانی نے اس سلیقے کو بھی بدل دیا اور پہلا بند چھ اور دوسرا آٹھ مصرعوں سے پورا کیا۔

اردو میں سانیٹ کچھ جدت کی دھن اور کچھ غزل کی جکڑ بندیوں کے ردِ عمل کے سائے میں آیا تھا۔ صرف یہی نہیں اپنی مخصوص ہیئت کے پیشِ نظر اس کے مضامین میں زیادہ وسعت اور گہرائی کی گنجائش بھی کم ہی تھی۔ چنانچہ جب جدید تحریکوں نے اختر اور اس کے ڈھب کی غنائی شاعری کا طلسم توڑا تو شعرا نے محسوس کیا کہ سانیٹ کی ہیئت ان کے جدید شعری تقاضوں کو کم ہی پورا کرتی ہے اور پھر جب اس میں مینا کاری کے لئے اسی کلاسیکیت کے سہاروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے خلاف بیسویں صدی کے وسط میں اس قدر جدوجہد سے کام لیا گیا تو ان کو یہ فعل عبث نظر آنے لگا۔ چنانچہ وہ صنفِ سخن جس کا غلغلہ ابھی بیس برس پہلے اس قدر بلند تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، اب اس قدر تیزی اور سرعت سے ختم ہوگیا جیسے اس کا کوئی نام بھی باقی نہ رہا ہو۔ آج اگر یوسف ظفر اور ضیا جالندھری ایسے بعض جدید شعرا کبھی کبھار زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایک آدھ سانیٹ کہہ لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں زندگی کی ابھی کوئی رمق باقی ہے۔ اور اب کچھ اردو میں کینٹو کے بارے میں۔

ن م راشد، جن کے ساتھ جدید اردو شاعری میں نئی اصناف کو داخل کرنے کے کچھ سلسلے وابستہ ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں مصر، شام، ایران وغیرہ گئے۔ واپسی پر انہوں نے اپنی ایک طویل نظم سے اردو شاعری کو آشنا کرایا۔ اس نظم کا عنوان ہے "ایران میں اجنبی"۔

"ایران میں اجنبی" کے تحت راشد کے سامنے ایک بہت بڑا موضوع اور ایک نہایت وسیع کینوس تھا۔ ایک نئے ماحول بلکہ ایک نئی دنیا میں پرانی تہذیب کا ایک فردِ تنِ تنہا کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ کسی قدر مبہوت تھا لیکن اس کے دل و دیدہ دونوں کھلے تھے اور ان میں حالات کا جائزہ لینے، زندگی کو پیش کرنے اور جذبات و احساسات سے ہمکنار

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

شہیدِ ملّت

سردار امیر اعظم خاں

"قائدِ ملت" خان لیاقت علی خاں کو میں نے سب سے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ ۱۹۲۶ء-۲۷ء میں یو پی کی مجلس قانون ساز کے انتخابات کے سلسلے میں کرنال سے مظفر نگر تشریف لائے۔ کئی دن سے اُن کی آمد آمد کا چرچا تھا اور ضلع کے بیشتر مقتدر حضرات، جو اُن کے انتخاب میں دلچسپی رکھتے تھے، اس وقت ان کے استقبال کو جمع تھے۔ مرحوم اس سے کچھ ہی عرصہ پیشتر اپنی تعلیم کی تکمیل کرکے انگلستان سے واپس آئے تھے۔ جب وہ کار سے اترے تو علی گڈھ کٹ کا پاجامہ اور گہرے نیلے رنگ کا بند گلے کا کوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے، سر پر سُرخ رنگ کی چھوٹی باڑھ کی ترکی ٹوپی تھی اور پاؤں میں پمپ شو، علی گڈھ فیشن کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں، اور آنکھوں پر عینک لگی تھی جب وہ لوگوں سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ تو ان کے چہرہ پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی اور ان کے کھلتے ہوئے گندمی رنگ اور بھرے ہوئے جسم پر یہ لباس بہت بھلا اور خوش نما معلوم ہوتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ انگلستان کے بجائے ابھی ابھی علی گڈھ سے آئے ہوں۔

جب وہ انتخاب میں کامیاب ہو گئے۔ تو ان کے مخالف نے اُنکے خلاف اپیل دائر کر دیا، گو انتخاب کے دوران میں مرحوم کا کافی روپیہ صرف ہوا تھا، مگر اپیل کے سلسلے میں چند ماہ کے اندر اندر اس سے بھی کہیں زیادہ روپیہ صرف ہو گیا جس وقت عدالت کے روبرو اُن کا اپنا بیان قلم بند ہو رہا تھا۔ عدالت نے کسی مخصوص فرد کے متعلق یہ دریافت کیا کہ کیا وہ الکشن کے دوران میں مرحوم کا ایجنٹ تھا یا نہیں؟ قائدِ ملت نے لاعلمی کی حالت میں جواب دیا کہ نہیں۔ بیان ختم ہونے کے بعد جب وہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے، تو اُنہیں بتایا گیا کہ انہوں نے بہت اچھا جواب دیا اور اگر وہ اقرار کر لیتے تو اپیل ہار جانے کا امکان تھا۔ مرحوم کو جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو فوراً دوبارہ عدالت کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہدیا کہ وہ شخص ان کا ایجنٹ تھا اور لاعلمی کی حالت میں انہوں نے پہلے صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ اُن کی اس صاف بیانی اور صداقت سے عدالت اور دیگر سب لوگ بے حد متاثر ہوئے، اور اللہ نے انہیں اپیل میں بھی کامیابی عطا کی۔ قائدِ ملت کا اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے یہ اصول تھا خواہ نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ دیانت اور صداقت کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ مرحوم تمام عمر اس پر کاربند رہے۔

۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حصول کے لئے جو انتخابات ہوئے ان میں مرحوم مرکزی مجلس قانون ساز کے لئے کمشنری میرٹھ کے حلقے سے امیدوار تھے۔ جمعیت العلماء ہند اور علمائے دیوبند کی مخالفت کی وجہ سے مقابلہ بڑا شدید تھا۔ کانگریس نے اس حلقہ پر پورا زور دے رکھا تھا اور روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔ کانگریس نے تقریباً ۹ لاکھ روپیہ صرف کر دیا اور اس نشست کو ٹیسٹ الکشن بنا لیا۔ ہر بالغ کو حق رائے دہی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے رائے دہندگان کی فہرست مختصر تھی، اور ایک ایک رائے کی بڑی قیمت۔ مقابلہ اتنا سخت تھا کہ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ کامیابی مشکل ہے۔ ہر روز رات کو میں انتخابات کے متعلق قائدِ ملت کو رپورٹ دیا کرتا۔ ان کا حکم تھا کہ خبریں مخالف ہوں یا موافق، انہیں صحیح صحیح اطلاع دی جائے۔ انتہائی بُری خبر سُن کر بھی میں نے کبھی ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہیں دیکھے۔ وہ ہمیشہ پُرسکون رہتے اور کہا کرتے کہ یہ میرا ذاتی الکشن نہیں ہے۔ یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے۔ قوم کو طے کرنا ہے کہ وہ پاکستان کے حصول کے حق میں ہے یا نہیں۔

ایک گاؤں میں ایک ہی برادری کے تقریباً ڈھائی سو ووٹ تھے۔ وہ

مسلم لیگ کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ کانگریس نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کی پنچایت کے لئے گاؤں میں ایک کنواں بنوا دینگے۔ مسلم لیگ والوں کے یہ سمجھانے پر کہ پوری قوم کے مستقبل کا سوال ہے۔ یہ لوگ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اگر لیاقت علی خاں کنوئیں کی کھدائی کا نصف خرچ جو تین سو روپیہ ہوتا تھا، پنچایت کو دیں تو وہ اپنے سارے ووٹ مسلم لیگ کو دے دیں گے۔ جب یہ بات قائدِ ملت کے گوش گزار کی گئی، اور کارکنانِ لیگ نے زور دیا کہ یہ رفاہِ عامہ کی بات ہے لہٰذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے تو قائدِ ملت نے بڑے اطمینان سے یہ جواب دیا کہ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ہمارا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو دولت میں ہم سے بہت آگے ہے۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ہم اس میدان میں ان کا مقابلہ کریں کہ جہاں ہماری ہار یقینی ہے۔ دوسرے یہ میری ذاتی ہار جیت کا سوال نہیں اصول کا سوال ہے۔ قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے۔ ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم پاکستان قائم کر کے آزادی یا عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا غلامی کی۔ اگر قوم پاکستان کے حق میں ہے تو روپیہ کے تصرف یا کسی چیز کے لالچ کا کوئی سوال نہیں ـــــ اور پھر اگر قائدِ اعظم اور ہم روپیہ صرف کر کے اس قوم کے لئے پاکستان خریدیں تو ایسے پاکستان کی کیا قدر ہوگی اور اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ یہ قوم پھر پاکستان کو دشمنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھ دے گی؟ جب اس گاؤں کے لوگوں کو قائدِ ملت کے ان خیالات کا پتہ چلا تو انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر کے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیئے۔ قائدِ ملت کا یہ فیصلہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ انہیں اپنی قوم پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ قوم کے صحیح کردار کو پہچانتے تھے کہ وہ روپے کی خاطر اصول کو قربان نہیں کرے گی۔

قائدِ ملت کا ہاتھ ہمیشہ قوم کی نبض پر رہتا۔ وہ نہایت ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے۔ انہیں کبھی غصہ نہ آتا اور ہمیشہ اپنا دماغی توازن برقرار رکھتے۔ وہ ہر ایک کی بات بڑے غور سے سنتے۔ ان کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا کہ انہیں یہ بات پسند آئی یا ناپسند۔ ہر ایک کی بات بڑی خندہ پیشانی سے سن لیتے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس قدر مقبول تھے۔ ملک کے طول و عرض میں بیشتر سیاسی کارکنوں کو وہ نام اور شکل سے پہچانتے اور ہمیشہ ان کی ہمت افزائی اور دلجوئی کرتے۔ تمام سیاسی کارکن انہیں صحیح معنوں میں اپنا قائد اور دوست سمجھتے اور ان کی عزت کرتے۔ بلاشبہ وہ قوم کے قائد پہلے تھے اور وزیرِ اعظم بعد کو۔

مرحوم کے کردار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ کبھی کسی کی سفارش سنتے اور نہ کسی کی سفارش کرتے۔ صرف وہ کام کرتے جس میں پوری قوم کے مفاد کا سوال پنہاں ہوتا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی فرد کی اس لئے مدد نہیں کی کہ وہ ان کا رشتہ دار یا دوست تھا۔ وہ کہا کرتے کہ قائدِ اعظم کی اور ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ قوم کو اس کا صحیح حق مل جائے۔ اس کے بعد ہر فرد اگر وہ کسی چیز کا اہل ہے تو خود اپنا حصہ اپنی قابلیت کی بنا پر حاصل کرے۔ جس زمانہ میں مرحوم ہندوستان کی عارضی حکومت میں وزیرِ خزانہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کے ایک دیرینہ ملنے والے نے ان سے اپنے تعلقات جتاتے ہوئے کچھ مراعات طلب کیں۔ قائدِ ملت نے جواب دیا کہ میرے دل میں ذاتی تعلقات کا بڑا احترام ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ انہیں تعلقات کی بنا پر میں آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جائے تو اس پر پوری قوم کا یکساں حق ہوتا ہے، نہ کہ اس کے احباب اور رشتہ داروں کا۔ بلکہ میرا تو یہ ایمان ہے کہ کسی شخص کا وزیر بن جانا اس کے احباب اور رشتہ داروں کے لئے ڈِس کریڈٹ ہونا چاہیئے۔

قائدِ ملت کو عمدہ لباس کا شوق تھا۔ ان کا عمومی رہن سہن بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے کہ ان کا خرچ زیادہ ہے۔ لیکن وہ بڑی احتیاط سے خرچ کرتے اور کوئی ان کے رہن سہن سے ان کے اخراجات کا اندازہ نہ لگا سکتا۔ وہ ایک بڑی جائداد کے مالک تھے جس کی آمدنی ہزارہا روپیہ ماہانہ تھی، مگر مرحوم نے کبھی اپنی ریاست سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ سے زیادہ نہ لیا۔ اپنے علاقہ میں وہ واحد زمیندار تھے، جو مقروض نہ تھے۔ وہ روپیہ کا صحیح مصرف جانتے تھے اور انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود گھریلو معاملات اور نظام پر پوری نظر رکھتے تھے۔

مرحوم کی تمام جائداد ہندوستان میں رہ گئی، جو بعد کو متروکہ قرار دی گئی۔ وہ چاہتے تو اور لوگوں کی طرح اپنی جائداد کا آسانی سے تبادلہ کر لیتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب ان کے کارکنوں نے ان کی جائداد کے تبادلہ کا انتظام کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر تبادلہ کرنے سے انکار کر دیا کہ لاکھوں مہاجر ایسے ہیں جن کی جائداد وہاں رہ گئی ہے، ان کا یہاں کوئی سہارا نہیں۔ اگر اس حالت میں میں اپنی جائداد کا تبادلہ کر لوں تو کل خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

قائدِ ملت بڑے راسخ الاعتقاد مسلمان تھے۔ پاکستان اور پاکستان کے عوام کی محبت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ ان سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ پنجاب کے گذشتہ انتخابات کے بعد لاہور میں

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

عزت ماب ڈاکٹر خان صاحب اور عزت ماب سردار بہادر خان کا سرحدی عوام سے خطاب

وحدت مغربی پاکستان

عزت ماب سردار امیر اعظم خان
دستورساز اسمبلی میں وحدت مغربی پاکستان
کا مسودہ قانون پیش کررہے ہیں

عزت ماب پیر علی محمد راشدی کی "وحدت مغربی پاکستان کانفرنس" حیدرآباد (سندھ) میں تقریر

عرس شاه عبداللطیف بهٹائی رح

(مغربی پاکستان د ایک اهم ثقافتی اجتماع)

عرس کے موقع پر شاه عبداللطیف رح کے کلام کی ڈرامائی پیشکش

زائرین د هجوم
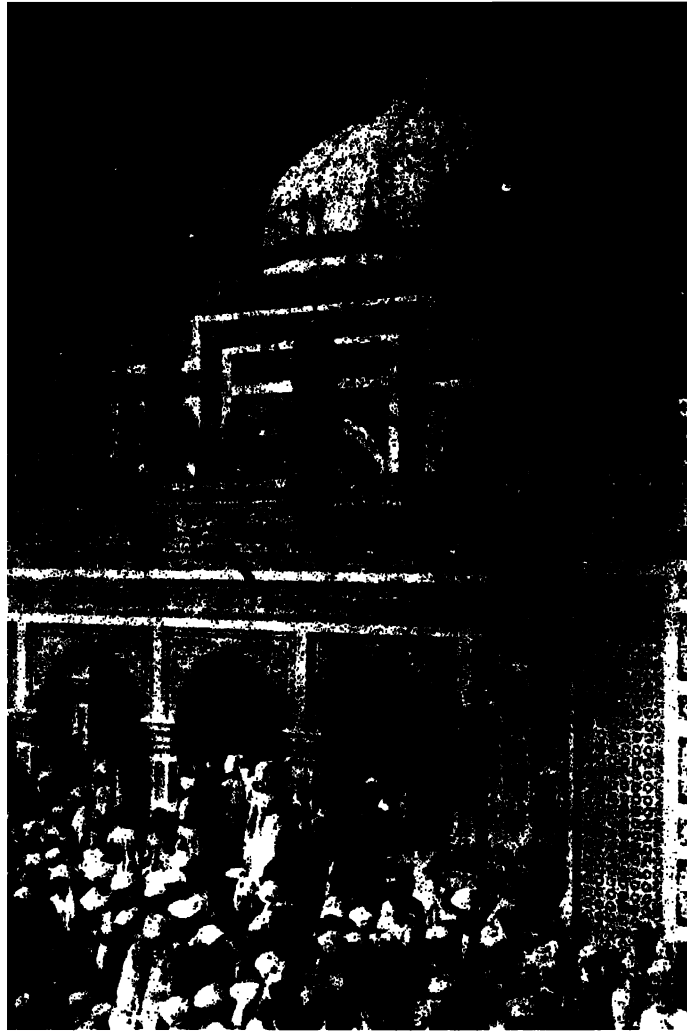
میلے پر رونق

""چون عشق حرم باشد سهل است بیابان ها""

پرشوق راهی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

روشن صدیقی

کتابِ عشق کا رنگیں کلام لیکے اُٹھا
محبتِ ابدی کا پیام لیکے اُٹھا
قیودِ وقت سے آزاد تھا وہ بندۂ عشق
فروغِ صبح، بہ ہنگامِ شام لیکے اٹھا
گمان و وہم کی ظلمت فروز وادی میں
یقینِ عشق کا ماہِ تمام لیکے اُٹھا
پھر اُس نے جادۂ خاصانِ حق کیا روشن
ہزار مشعلِ سوزِ تمام لیکے اُٹھا
بہ قدرِ ذوق ملا جس سے میکشوں کو سرور
بنامِ عشق وہ کاس الکرام لیکے اُٹھا
لُٹائے دیدۂ پُرنم سے اس نے لعل و گہر
خزانۂ غمِ دردِ عوام لیکے اٹھا
بہائے کوثر و تسنیم ریگ زاروں میں
اگرچہ ایک شکستہ سا جام لیکے اٹھا
جہاں ہوس نے بنائے تھے لاکھ بت خانے
وہاں وہ وحدتِ بیت الحرام لیکے اُٹھا
محمدِ عربی کے سحابِ رحمت سے
گہر فشانیٔ فیضانِ عام لیکے اُٹھا

شہ لطیفؒ، عزیزِ انام، مردِ ولی
دیارِ سندھ، از اُو یافت دولتِ ازلی

صہبائے لطیف

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجمہ : عاصمہ حسین

کونج

اُجلی اُجلی کونجیں، کل ہی کتنے جھرمٹ سے انکے
اُڑ اُڑ کر اس دیس سے جانے کتنی منزل دُور گئے
اب کیا اس اتھلے پانی کی کھائی میں رہنے سے حاصل؟
اُڑ کے گئے جب سارے ساتھی۔ بنکھ ملے اور دل سے دل
اپنی سنگت وہ کب چھوڑیں، کیوں چھوڑیں وہ اپنا ساتھ؛
ان کے من یوں ساتھ ملے ہیں جیسے باہم پات سے پات
سب جاتے ہیں سنگت میں، اس اجلی کجلی ٹولی میں
من میں جتنا پریم ہو بس اتنا ہی دھن ہے جھولی میں
اتنا ہی رس ہے، اتنی مٹھاس اور اس کا کوئی انت نہیں
کونجیں کونجیں ساتھ رہیں، بھٹکیں نہ سبھوں سے دور کہیں
اپنی قوم سے ہٹ کر رہنا کونجوں کا دستور نہیں
اس سے بڑا ان کی دنیا میں کوئی اور قصور نہیں
ننھی کونج، اے ننھی کونج! آواز کو اپنی خوب اٹھا
جیسے بھی بن آئے اس پیغام کو اپنوں تک پہنچا
دن بیتا اور رات بھئی، بھیگی رات اور رات گئی
قسمت تیری ٹولی کو اس نیارے دیس میں لائی تھی
لیکن ان کے من میں بسی تھی اپنی پہاڑوں کی بستی
اسی کی ان کے من میں لگن تھی۔ اسی کی من میں پریت بسی
اس میں کسی کا دوش نہیں ہے، رہ گئی تنہا پھر بھی کیا
اپنا دھنی ہے فکر میں اپنی، آن دے گا تجھے آن داتا
ننھی کونج! اس جھرمٹ میں کل خوب اک بات کا چرچا تھا:
دیپ ہے تیری پریت کا ہر ہر ساتھی کے من میں جلتا
پر افسوس! او جھل ہے تری آنکھوں سے جال شکاری کا
حال نہیں ہے تجھ پر روشن خود اپنی لاچاری کا

التجا

سنتی ہوں میں جھاڑ جھنکاڑوں سے پُر ہیں بن کے بن
میں یہ کیا جانوں۔ یہ باتیں کیسے جانے میرا من؟
لوگ کہتے ہیں کہ پھیلے ہیں کئی صحرا یہاں
لوٹ بھی آ جانِ من! جینا ہوا بارِ گراں
اے مرے ساجن! مرے دل کو نہ یوں ویران کر
یوں نہ لا کر چھوڑ دے لاچار سونی راہ پر
میں یہ کیا جانوں کہ پھیلے ہیں یہاں پُر خار دشت
خار کیسے ملک ہیں انگار ہی انگار دشت
دیکھ پیارے! گھونٹ پانی کا بھی میں پیتی نہیں
گرچہ جیتی ہوں سمجھتی ہوں کہ میں جیتی نہیں
دیکھ کیسے دوڑتی ہے کاٹنے کو ہر چٹان
چلچلاتی دھوپ جھلساتی ہے، تڑپاتی ہے جان
دیوں کہے شاعر کہ لُو چلتی ہے لو دیوانہ وار
سو ستم، سو آفتیں، سو مشکلیں اور ایک نار!
آ بھی جا اب میرے ساتھی، آ بھی جا اے میرے میت
بات جب ہے آج اپنی لاج رکھ لے تیری پریت
دیکھ اس ویرانے میں ہیں کیسے بے ہنگم سے جھاڑ
روکتی ہے ہر قدم پر راستہ کانٹوں کی باڑھ
لوگ کہتے ہیں کہ ان جھاڑوں میں زہری ناگ ہیں
آگ کے اندر یہ گویا اور جیتی آگ ہیں
پاس آ میرے، مرے پیارے، مرے دلدار آ
تو ہی اس مہلک بیاباں میں ہے میرا رہنما
کوئی میرا، کوئی اپنا کیا مرا غمخوار ہو
تم ہی سامانِ تسلی اے مرے دلدار ہو

سید احسینؒ

اس بچاری نے نہ دیکھا تھا کبھی وہ ریگ زار
کوئی ہم صورت میسر تھا نہ کوئی غمگسار
تیرہ و تاریک تھی دھرتی بھی اور آکاش بھی
پیاری بہنو! اس گھڑی، جو تھی قیامت کی گھڑی
ڈاچی والے کو بنایا اس نے اپنا دادخواہ
اس کی ہمدردی سے پائی رنج میں تسکین کی راہ

بنگلہ افسانہ:

بجلی

مبین الدین احمد
مترجمہ: فیض احمد چودھری

سعید پور مشرقی پاکستان کا ایک گمنام گاؤں ہے۔ گاؤں بھر میں اَن پڑھ کسان ہی بستے ہیں۔ بہت دن پہلے فقط ایک شریف گھرانا یہاں بستا تھا جو اس پرگنے کا زمیندار بھی تھا۔ اب زمینداری غیروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس زمیندار خاندان کا ایک ہی چشم و چراغ رہ گیا ہے ــــ وہ بھی بائیس تیئیس سال سے پردیس گیا ہوا ہے اور ایک دن کے لئے بھی یہاں نہیں آتا۔ (اب یہاں) ان کی کھوئی ہوئی عظمت کی آخری نشانی صرف اس عالیشان عمارت کا کھنڈر باقی ہے جو بھوتوں اور جنات کا مسکن معلوم ہوتی ہے۔

گلتانی اس غیر مشہور گاؤں کے غریب کسان شیخ مدار کی اکلوتی بیٹی ہے۔ طبیعت میں اس کی شوخی اور اچپلاہٹ ہے، نہ کسی سے ڈرتی ہے اور نہ اسے کسی بات کی پروا۔ سارے طور طریق بالکل لااُبالی۔ اسکا اصلی نام کریمن تھا مگر یہ نام اب کسی کو یاد نہیں۔ فطری عادات و اطوار کی مناسبت سے اس کا نام گلتانی پڑ گیا ہے۔

بچپن ہی میں اس کی شادی ہو چکی تھی۔ کوئی پانچ سال ہوئے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ گلتانی اس وقت دس گیارہ سال کی تھی۔

آج وہ بھرپور جوانی کی آغوش میں ہے۔

گلتانی کالی ہے۔

صرف کالی کہنا کافی نہیں، بلکہ آبنوس کی طرح کالی ہے، مگر بدصورت نہیں۔ اس کی صورت میں بڑی دلکشی ہے۔

گلتانی گویا کسی ماہر سنگ تراش کی مدت کی مشق و ریاض کا نتیجہ ہے۔ اس کا مکمل سا حسین ملائم جسم۔ ناک نقشہ، آنکھیں اور بال سب کے سب اپنا جواب آپ ہی ہیں۔ بدن میں ناموزونی کہیں نام کو نہیں۔ کہیں بھی ذرا سا داغ یا ناہمواری نہیں۔ ہنستی ہے تو صرف گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

گلتانی کے نادر حسن کو پرکھنے والی آنکھ اس گاؤں میں نہیں، یہ بات تو یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے گالوں کے گڑھے پر سب کی نظر پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گال کا گڑھا نحوست کی نشانی ہے۔ کہتے ہیں ایسی عورتوں کے شوہر زندہ نہیں رہتے۔ گلتانی کے بیوہ ہونے پر سب کے دل میں یہ وہم اور بھی راسخ ہو گیا۔

سب لوگ کہتے ہیں زندگی میں اسے اور کوئی خوشی نصیب نہ ہوگی ...... ہنستے وقت اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

اگرچہ اس کے حسن و زیبائی کو کوئی نہیں دیکھتا اور اس کے گال میں منحوس گڑھے بھی پڑتے ہیں۔ پھر بھی گلتانی کی سرشار جوانی بہت سے لوگوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ہر وقت بڑے سلیقے سے بن ٹھن کے رہتی ہے۔ خوشحال شیخ مدار کی اکلوتی بیٹی نصیب ہے تو کیا، باپ کی لاڈلی تو ہے۔ رنگین لباس پہن کے اور چوٹی میں کوئی پھول گوندھ کے وہ محلے میں سیر کو نکلتی ہے ..... کسی کی روک ٹوک کو وہ سنتی ہی نہیں۔

عجیب لڑکی ہے گلتانی۔

سب کے سامنے نکل آتی ہے، بات کرتی ہے، اور موقع بے موقع ہنسی میں جھومنے لگتی ہے، لچک جاتی ہے۔ گلتانی کی حرکات جسمانی،

نازو ادا، طور طریق اور بات چیت میں ایک ایسا شور انگیز، پُر معنی اور لطیف اشارہ ہوتا ہے کہ بے ساختہ دل کو لبھاتا ہے مگر ہاتھ بڑھاؤ تو گلتانی تک نہیں پہونچتا۔ گویا کہیں اٹک کے رہ جاتا ہے۔

جیسے وہ بلور کی شفاف اور سخت دیوار کی اوٹ چلتی پھرتی ہو۔ نظر سب کچھ آتا ہے مگر اسے کسی طرح چھوا نہیں جاسکتا۔

گلتانی صرف ایک ہی شخص سے ذرا جھینپتی ہے اور اس کا لحاظ بھی کرتی ہے۔ گنجر بائیس تئیس سال کا ہٹا کٹا نوجوان ہے۔ سر پر گھنے گھونگھر والے بال۔

گنجر کے سامنے گلتانی کا اونچا سر خود بخود نیچا ہو جاتا ہے — سینے کے اندر دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

گنجر گلتانی کو "گل" کہہ کے پکارتا ہے اور کبھی "گلّی"۔

مراد مصور

ایک زمانے میں اسے اپنی فنکاری پر بڑا ناز تھا۔ اب مصوری اسکا پیشہ ہے۔ باپ کے جیتے جی مراد کو فن کی تحصیل کا چنداں موقع نہ مل سکا دولتمند باپ کا اکلوتا بیٹا معمولی مصور یا نقاش نہیں ہوسکتا۔ اسے تو جج یا مجسٹریٹ ہونا چاہیئے۔ باپ کی خواہش لے دے کے بس اتنی تھی۔

مراد کے باپ کے نزدیک دستکار اور نقاش میں کوئی فرق نہ تھا گھٹیا چیز کوئی بڑا نام دینے ہی سے شاندار نہیں بن جاتی۔

مراد کے باپ کی رائے ایسی پختہ تھی کہ اسے بدل دینے کی طاقت مراد میں نہ تھی۔ لیکن مراد کی فطری صلاحیت باپ کی مرضی کے مطابق کام نہ کر سکی۔ باپ بیٹے کی ان متضاد خواہشوں میں برابر کشمکش جاری رہنے کی وجہ سے مراد نے ٹھوکریں کھاتے کھاتے کس طرح بی۔ اے تو پاس کر لیا مگر جج یا مجسٹریٹ نہ بن سکا۔

ماں بہت دن پہلے مرچکی تھی، باپ کے انتقال کے بعد دنیا میں اس کا اپنا کوئی نہ رہا۔ گاؤں کے عالیشان مکان کے سوا مراد گاؤں کی ساری جائداد بیچ کر پیرس روانہ ہوگیا۔

فن کے سیکھنے میں لگاتار ریاض کے ساتھ ساتھ مراد نے پیرس میں اور بھی بہت سی باتیں سیکھ لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا روپیہ اُڑا دینے میں اسے چند سال سے زیادہ نہ لگے، اور جب وطن واپس آیا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔

اتنی مدت تک گاؤں کی اس موروثی عمارت کا اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ وطن واپس آنے کے چند روز بعد ایک دن یکایک اس کے دل میں آیا کہ گاؤں کی اس عمارت کے بیچنے سے کئی ہزار روپیہ ہاتھ آئے گا۔ اور جب تک روزگار کی کوئی اچھی سبیل نہ نکلے اس وقت تک تنگدستی اور فکرِ معاش سے نجات ملے گی۔

اس کے بیچنے میں کوئی دقت بھی اسے نظر نہیں آتی تھی۔ برابر کے گاؤں کے جن لوگوں نے اس کی دوسری جائداد خریدی تھی ان میں سے جس کو بھی یہ عمارت مل جائے وہ خوش ہی ہوگا۔

گاؤں میں گلتانی کے ناکام چاہنے والوں کا ایک گروہ تھا، جو گلتانی سے انتقام لے کر اپنا جی ٹھنڈا کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔ موقع ایک دن خود بخود ہی پیدا ہوگیا۔ شیخ سمیر گاؤں کا مکھیا تھا گاؤں میں اسکا بڑا اثر تھا۔ شیخ سمیر کی پچاس سال کی عمر تھی، جب اسکی تیسری بیوی دو تین چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر گئی تو بعضوں نے اسے گلتانی سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔

— گلتانی ہی سے نکاح کر لو پردھان — دیکھوگے کہ وہ تمہارا گھر بار کس طرح سنبھال لیتی ہے! اس کا گھمنڈ بھی کم ہو جائیگا۔۔۔۔ گاؤں کے لونڈے بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

مکھیا نے کہا: گلتانی کے تو گاؤں میں گُن گائے جاتے ہیں، کیا اس سے شادی کرکے میں وقت سے پہلے ہی مر جاؤں؟

— تم کیوں مرنے لگے چودھری! اس سے شادی کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ اس کا شوہر مرا۔ تمہاری بیوی مری۔۔۔۔ نحوست کا چکر تو ختم ہوا۔

پردھان نے کہا: بات تو تم نے ٹھیک کہی۔۔۔۔ اچھا میں اسی سے نکاح کرلوں گا۔ دیکھنے میں وہ خاصی اچھے ہاتھ پاؤں کی ہے۔

چودھری کے چہرے پر ہنسی کی ہلکی سی لہر داڑھی مونچھوں کے جنگل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔

مگر گلتانی نے چودھری کا پیغام بے دھڑک رد کردیا۔ جو شخص پیغام لے کے آیا تھا اس سے کہا: اپنے پردھان سے کہہ دینا کہ گلتانی کو گلے میں پھانسی ڈالنا منظور ہے مگر اس بڈھے کھوسٹ کا گھر آباد نہیں کرے گی۔

گلتانی کی ماں نے مارے ڈر کے ٹوکا کہ بات تو سُن حرامزادی!

ارے! یہ تیری قسمت جاگی ہے کہ چودھری تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ چودھری کے پاس دھن دولت، زمین سبھی کچھ ہے۔ تیرے دل میں آخر ہے کیا؟

گلتانی نے ناک بھوں چڑھا کے کہا: ایسے روپے پیسے اور زمین کو جھاڑو پھیرتی ہوں۔

جو شخص یہ پیغام لے کے آیا تھا وہ گلتانی کا منہ بولا دولہا بھائی تھا۔ اس نے ذرا چھیڑ خانی کی کہ بوڑھا کتنا پیار کرے گا تمہیں، دیکھنا۔ پیچھے پیچھے پھرے گا جیسے پالتو کتا۔

دولہا بھائی نے زور کا قہقہہ لگایا۔

گلتانی نے کہا: تو پھر کہہ دینا کہ ویسا ہی ایک جانور ڈھونڈھ لے، اپنے لئے ـــــ میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔

زیادہ بات کی ضرورت نہیں۔ وہ شخص واپس چلا گیا۔

یہ باتیں سن کر شیخ سمیر بھڑک اٹھا، اتنی بڑی بات! گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے کہا: دماغ دیکھا لونڈیا کا؟ تم اس کا کوئی علاج کرو چودھری؟ کوئی ترکیب نکالو۔

گلتانی کے ناکام عاشقوں نے کہا: گلتانی کے رنگ ڈھنگ برے اور چال چلن خراب ہے۔ رات کو تالاب کے کنارے اکیلے میں وہ اور گنجر ایک دوسرے کی بغل میں بیٹھ کے پریت کے گیت گنگناتے ہیں۔

مکھیا نے کہا: ہائیں! اچھا مزا چکھاتا ہوں میں ٹھہرو!

گاؤں میں پنچایت بیٹھی ہے۔

گلتانی کا مقدمہ درپیش ہے۔

گلتانی اپنے خلاف الزامات سن کر آگ بگولا ہو گئی۔ ایسی جھوٹی بات نہ کہو، چودھری۔ مجھ پر جو ایسا طوفان اٹھائے گا وہ کوڑھی ہو جائے گا۔

مکھیا ہنسا اور کہا: وہ تو دیکھا جائے گا بعد میں ـــــ اب ناپ کے دو ہاتھ زمین سے ناک رگڑ۔ آئندہ کسی دن تجھے گنجر کے پاس پھٹکتے دیکھا تو سخت سزا ملے گی۔ سمجھی؟

گنجر اب تک مجلس کے ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ یک بیک اٹھ کر بولا: تمہیں سزا دینی نہیں پڑے گی، پردھان ـــــ میں اس سے شادی کروں گا۔

مجلس پر بجلی سی گری۔ گلتانی نے گنجر پر ایک نگاہ ڈال کے آنکھیں نیچی کر لیں۔ ساری مجلس ہکا بکا رہ گئی

مکھیا نے گرج کر کہا: شادی کروں گا۔ منہ سے کہہ دیا اور ہو گئی شادی۔

ـــــ کیوں، شادی پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟

ـــــ اعتراض! اعتراض تو بڑا بھاری ہے! اگر وہ ہم تمہیں بتائینگے نہیں، گنجر!

گنجر خاں چلا اٹھا، بتاؤ گے کیسے نہیں۔ بتانا پڑے گا۔

ـــــ اچھا رے۔ اتنی بڑی بات! مار حرامزادے کو۔

آن کی آن میں بہت سے مخالف ہاتھ گھونسے تان تان کے اٹھے اور گنجر پر پل پڑے۔

ایک خوفناک ہنگامہ اور شور وغل میں مجلس برخاست ہو گئی۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ گنجر گاؤں چھوڑ کے شاید کہیں چلا گیا۔ گلتانی بالکل گم سم رہ گئی

مراد بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آیا ہے! اس کا عاشق فن دل گاؤں کے ہر منظر پر لوٹ ہے۔ سارے دن وہ بڑے شوق اور انہماک سے تصویریں کھینچتا ہے۔

کل جو لوگ اس کی رعیت تھے آج وہ اور دل کی پرجا ہیں، تب بھی پرانی رعیت میں سے ایک ایک کر کے بہت سے لوگ پرانے آقا کی اولاد سے ملاقات کرنے آئے۔ کوئی شخص اس سے زیادہ بات نہیں کرتا۔ ـــــ شاید ہمت نہیں پڑتی ـــــ پھر بھی جو آتا ہے، سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

مراد انسانی صحبت کی کمی کو قدرتی مناظر کی زیبائی اور دلفریبی سے پورا کر لیتا ہے۔ گاؤں اسے بے حد بھلا لگ رہا ہے

مراد تصویر کھینچ رہا ہے۔

بل کھاتی ہوئی ندی کہیں نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ چھوٹی بڑی طرح طرح کی ناویں ایک کے بعد ایک بہی چلی جا رہی ہیں۔

اس پار جہاں تک نظر جاتی ہے دھان کا ہرا کھیت ہے۔ پاس پار کھنڈرات میں ایک ٹوٹا پھوٹا محل۔

کتنی حسین تصویر! سب کچھ یا سچ مچ کے باغ ــــ سچ مچ
کے درخت، کتنی خوبصورت چھوٹی چھوٹی نالیاں ــــ جیسے بالکل
اصلی! ناریل کا درخت ــــ ناریل! واہ وا..... ! مراد تصویر کو
نظر اٹھا کر حیران رہ گیا۔ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی.... رنگ
سانولا۔ مگر جسم بے عیب نہایت متناسب جس میں عنفوانِ شباب
کی بھرپور بہار ہے۔ ڈھیر کے ڈھیر کالے بالوں کی بھاری بھرکم چوٹی ــ
دھاری دار رنگین ساری میں لپٹی ہوئی پتلی کمر بڑی بڑی بادامی
آنکھوں میں حیرت لیسی ہوئی۔ ان باتوں نے مراد کا دل موہ لیا۔

ــ تمہارا نام؟

ــ گلتانی....

ــ گلتانی! نام تو بہت پیارا ہے۔

گلتانی نے کہا: جیسے آپ خوبصورت ہیں ویسی ہی سندر یہ
تصویر بھی کھینچی ہے۔

مراد نے کہا: میں کیا بہت خوبصورت ہوں؟

ــ بیشک! کتنا سندر ہے آپ کے بدن کا رنگ.... گورا
گورا، خوبصورت۔

ــ تم بھی سندر ہو.... مجھ سے کہیں زیادہ۔ گلتانی مسکرائی
گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔

گلتانی نے کہا: میں تو کالی ہوں۔

کالی ہو اسی لئے تو اور بھی خوبصورت لگتی ہو۔ تمہارا جسم، ناک،
آنکھیں، چہرہ، بال، "ڈُل" (گال کا گڑھا) سب مل ملا کے بے مثال ہو تم۔

"ڈُل" ہم ڈُل کیا؟

تم جب ہنستی ہو تو تمہارے گال میں جو.......

اوئی! ہنستے وقت گال میں گڑھے پڑ جانا؟

گلتانی کھلکھلا کے ہنس دی، کیا اسے "ڈُل" کہتے ہیں؟

گلتانی پھر ہنسی۔

ہنسیں کس بات پر؟

آپ کی بات سن کر۔ بڑا پیارا لفظ ہے...."ڈُل"

فقط لفظ ہی پیارا نہیں...... وہ خود بھی بہت پیارا ہے۔

گلتانی نے آنکھیں نیچی کرکے کہا: ہنستے وقت جن لڑکیوں کے
گال میں گڑھے پڑ جاتے ہیں وہ تو بد نصیب ہوتی ہیں.....
شوہر ان کے زندہ نہیں رہتے۔

کون کہتا ہے؟

سب ہی کہتے ہیں.... میں بھی جانتی ہوں۔

غلط، بالکل جھوٹ۔ گال میں "ڈُل" تو چہیتے پن کی علامت ہے
..... ایسی لڑکیاں پتی کو بہت پیاری ہوتی ہیں۔

مراد ہنسا۔

گلتانی کی بڑی بڑی آنکھیں خاموش مراد کا منہ دیکھتی رہیں۔

سعید پور گاؤں کا گاؤں مشتعل ہو گیا ہے۔ گاؤں والے سب
بپھرے ہوئے ہیں۔ نشانہ مراد ہے۔

رات کے ایک بجے۔

مراد بستر پر چپ چاپ پڑا ہے آنکھوں میں نیند نہیں۔ گھر کے کونے
میں شمع جلتے جلتے ختم ہونے پر ہے۔ باہر چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے ــ
موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بہت سے جھینگر بلند اور کرخت آواز میں لگاتار
چلا رہے ہیں کبھی کبھی گیدڑ کے بولنے اور ساتھ ہی کتے کے بھونکنے کی آواز
سنائی دیتی ہے۔ کہیں دور بجلی گری۔

یہ تو واقعی بری بات ہوئی۔

مراد نے اٹھ کر ایچی کیس سے ایک نئی موم بتی نکال کے جلائی۔
سگرٹ سلگا کے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کسان جس طرح بگڑے ہوئے
ہیں۔ اگر مجھے مار بھی ڈالیں تو عجب نہیں۔ تصویر کھینچنا ان کی نظر میں ویسے
ہی پاپ ہے۔ اس پر ایک نوجوان لڑکی کو ماڈل بنا کر تصویر کھینچنا! کئی
چھوکرے تو ابھی ابھی دھمکی دے گئے ہیں۔ دو ایک بوڑھے بزرگ بھی آئے
تھے۔ چھوکروں کا غصہ ہی شاید تیز ہے۔ ہونا ہی ہے۔

مراد نے ختم شدہ سگرٹ کا آخری کش لے کر اسے پھینک دیا۔ اور
دوسرا سگرٹ سلگا کر بچھونے پر آ بیٹھا۔

"پیرس میں بیشک ایسی باتیں عام ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں تو بڑے
بڑے شہروں میں بھی جو لڑکیاں یا عورتیں ماڈل بن کے روپیہ کماتی ہیں وہ
ہرگز شریف گھرانے کی نہیں سمجھی جاتیں۔ تو پھر میں نے کیوں ایسا احمقانہ کام
کیا؟ لیکن قصور تو دراصل لڑکی کا ہے۔ اس نے خود ہی تو مجھ سے اپنی تصویر کھینچنے کو
کہا اور پھر خود ہی شکایت کر دی۔ یہ لونڈیا بہت پاجی نکلی۔ البتہ اسے
اس بات کا سان گمان بھی نہ ہوگا کہ میں اسے ایک جانگیا دوں گا اور

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

افسانہ

کشمکش

حامد علی خاں

"کیوں بھئی۔ تھر میں بارش ہوئی؟" ہر جانی پہچانی صورت سے الہ ڈنو کا پہلا سوال یہی ہوتا۔ وہ سارا دن کارخانے میں اور رات سٹیشن پر گذارا کرتا۔ تھر کی طرف سے آنے والے مسافروں کی تلاش کرتا اور طویل سندھی علیک سلیک کے بعد جیا سے ان دنوں گراں گزرتی، پہلا سوال یہی کرتا تھا۔ جولائی کے مہینہ کے ساتھ ہی الہ ڈنو کا دل شہر کی زندگی سے اچاٹ ہو جاتا۔ وہ عیدپور خاص میں بھی صبح شام غیر متغیر نیلے آسمان اور بھورے افق کو دیکھا کرتا اور تھر کی سمت دیکھ کر بارش کے اندازے لگایا کرتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ دن کی گاڑیوں سے بھی مسافروں سے برسات کا حال ضرور پوچھتا۔ سٹیشن پر وہ اس وقت تک ٹھہرتا جب تک آخری گاڑی کے سارے مسافر باہر نہ چلے گئے ہوں۔ اسے پچھلے دو سال سے مایوسی ہو رہی تھی۔ دو سال پہلے قحط کے حالات میں بادلِ ناخواستہ تھر چھوڑ کر وہ شہر آیا تھا۔ کارخانہ میں کام مشکل سے ملا تھا لیکن ابھی وہ بارش کی خبر سنکر اپنے ریگستان کو لوٹنے کے لئے بے تاب تھا۔

اب کی بار تیسرے سال اسے قوی امید تھی کہ بارش ضرور ہوگی اور وہ اپنے گاؤں رتن کا تڑ جا کر ریتیلے پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی وسیع زمین کو کاشت کرے گا اور باجرے کی مرغوب لہلہاتی فصل لگائے گا۔ سٹیشن سے لوٹتے وقت اس کے پیروں میں فولادی طاقت آگئی۔ تیز قدموں سے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو منتظر بیوی نے شکایت کے لہجے میں کہا "آجکل رات گئے آتے ہو، ٹھنڈی روٹی کیا خاک اچھی لگے گی!"

"اری جنت! تھر میں خوب برسات ہو گئی۔ اب یہ گندم کی روٹی کھا کر کون بیمار پڑے۔ جانو تجیر کا بیٹا عرب آج سٹیشن پر ملا تھا، کہہ رہا تھا ہمارے مکان کے ٹیلہ پر تخنے برابر گھاس اگ آئی ہے۔"

جنت نے ایک لمبی ہوں بھری۔ وہ گویا نیم رضامندی کے انداز میں پوچھ رہی ہو، اب کیا ارادہ ہے؟ کیا تھر چلے گے؟

الہ ڈنو کہے جا رہا تھا۔ "اور ہاں، عرب کہہ رہا تھا کہ متارو کے پاس ہمارے جانور اچھی طرح ہیں۔" "گائے نے کیا جنا؟" جنت نے پوچھا۔

"بچھڑا۔ عرب نے تبلایا کہ متارو نے مشہور کر رکھا ہے کہ بچھڑا مر گیا۔ لیکن چوری چھپے اپنی سسرال بھیج دیا ہے۔ اب جاتے ہی اپنے جانور اس مردود کے شکنجے سے چھڑا لوں گا۔"

الہ ڈنو خوشی سے بہک رہا تھا۔

"روٹی کھا لو۔" بیوی نے رکابی تھماتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم جنت! باجرا نہ کھا کر دو سال گذر گئے۔ اب کی بار میں صرف باجرا بوؤں گا۔ تربوز بھی تھوڑے سے بو لوں گا۔ گوار بالکل نہیں۔"

"کیا جانوروں کو بھوکا مارو گے؟ گوار تو بونی ہی پڑے گی۔" جنت نے اعتراض کیا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر پوچھنے لگی "بس۔ نہ ہی لوا لے تو کھلتے نہیں۔"

"ہونہوں ہوں" اس نے چباتے چباتے نفی میں سر ہلایا اور پوپلوں کی طرح کہنے لگا "ذرا حساب لگا کر دیکھتا ہوں کہ اپنے جانور متارو سے مل سکیں گے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک پٹاری اٹھا لایا اور رقم گننے لگا۔ اطمینان کا سانس لیکر الہ ڈنو نے کہا "دھنی کی مہربانی سے تین سو ہیں۔ متارو کو دے کر اور سفر کا خرچہ چھوڑ کر پچاس، ساٹھ بچ رہیں گے۔"

"اگر متارو انکار کر جائے تو؟"

"میں برادری میں فیصلہ کرواؤں گا! اگر برادری نہ مانے تو میں پیر صاحب سے فریاد کروں گا۔"

"ہاں پیر صاحب سے ضرور عرض کرنا" خوش عقیدہ جنت کو

آخری ترکیب بہتر معلوم ہوئی۔

"تم کو پانی کی رقم تو ضرور دینی پڑے گی اللہ ڈنو۔" رتن کا تڑ کے مکھی کمال جونیجو نے فیصلہ کن تجویز پیش کرتے ہوئے برادری کے ارکان سے کہا "پچھلے دو سال سے ڈکار (قحط) تھا۔ کنوئیں پر پہرے دار بٹھانے سے پانی مہنگا پڑا تھا۔ متارو نے دو سال تک تمہارے جانوروں کی دیکھ بھال کی۔ دو بھیل اور ایک گائے کا دو سال کے لئے کیا خرچ بیٹھے گا؟ یہ آپ لوگ طے کریں گے۔"

"میں برادری کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ جو کچھ پانی کا حساب لگے گا وہ میں اسی وقت سب کے آگے دینے کو تیار ہوں۔ لیکن متارو کو بھی جانور سب کے سامنے اسی وقت حوالے کرنے ہوں گے۔" اللہ ڈنو نے اپنی شرائط گاؤں والوں کے آگے رکھ دیں۔

"سائیں سگورا" متارو نے جونیجو کی خوشامد کرتے ہوئے کہا "آپ بھولتے ہیں کہ ان تین جانوروں کے علاوہ ایک بچھڑا بھی چھ مہینے تک زندہ رہا۔ اس کا حساب بھی تو ہونا چاہیئے"

"یہ جھوٹ ہے کہ بچھڑا مر گیا ہے۔ تم نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ مجھے سب کچھ پتہ ہے" اللہ ڈنو نے کہا "تو بتاؤ کہاں ہے؟" متارو نے بھی جھوٹ کا خود اعتمادی سے دفاع کیا۔

"تمہارے سسرال میں کسی نے یہاں اسے مردہ نہیں دیکھا" اللہ ڈنو نے جواب دیا۔

"ہم نے دیکھا ہے۔"

"ہم نے بھی مردہ دیکھا ہے"

"ارے وہ! میں نے ہی تو اس کی کھال کھینچی تھی۔"

یکے بعد دیگرے متارو کے ہمراہی گواہی دینے لگے۔ ابھی یہاں تک بحث ہونے پائی تھی کہ لوگ ایکدم اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر طرف سے "سائیں بسم اللہ" "سائیں بسم اللہ" کہہ کر سلام کیا جانے لگا۔ اللہ ڈنو کی فریاد سننے کے لئے پیر صاحب یعنی سائیں بادشاہ بھی اپنے گوٹھ سے آ چکے تھے۔ اللہ ڈنو نے بڑھ کر اونٹ کی مہار تھام لی اور پیر صاحب سب کو شرف قدم بوسی بخشتے ہوئے ریت کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئے۔ مکھی جونیجو کو اپنی کرسی صدارت چھن جانے کا بری طرح احساس ہو رہا تھا لیکن پیر کے آگے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ متارو بھی مایوس ہو گیا۔ اسے اب پانی کے دام حسب دلخواہ ملنے کی امید نہ تھی۔ مکھی کی تمہید موثر تھی۔ برادری بھی پانی کی مہنگائی کی بات مان گئی تھی لیکن پیر صاحب سے خدشہ تھا کہ بات میں بات نہ پیدا کریں۔ پنچایت کا دوبارہ آغاز ہوا۔ طرفین نے صورت حال کی اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے وضاحت کی۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ بچھڑا واقعی مر گیا یا متارو کے پاس موجود ہے۔ متارو نے اپنے گواہ پیش کئے۔

"ہاں سائیں بادشاہ" تیسرے گواہ نے کہا "اس کی کھال میں نے خود اتاری ہے۔"

"وہ کھال کس کے پاس ہے؟" پیر صاحب نے دریافت کیا۔

"متارو کے پاس" گواہ نے کہا۔

"کھال کی قیمت بچھڑے کے چھ مہینے کے پانی کے خرچ سے بہت کم ہے۔ باقی جانوروں کا خرچ بھی کھال کی قیمت میں سے وضع ہونا چاہیئے۔"

مجمع سے "سبحان اللہ" اور "ماشاء اللہ" کی تائیدی صدائیں بلند ہوئیں۔ پیر صاحب نے متانت سے اپنا استدلال جاری رکھا۔ جب بچھڑا چھ مہینے تک زندہ تھا تو متارو نے اس کا دودھ بھی استعمال کیا ہوگا۔ معاملہ میں صرف جانوروں کی نگرانی کا خرچ ہے۔ دودھ کا حق اللہ ڈنو کو پہنچتا ہے ــــ کھال اور دودھ کی قیمت پانی کے خرچ میں سے کم کر لینی چاہیئے۔"

"الحمد للہ۔ بہت ٹھیک ہے" حاضرین میں سے چند نے کہا۔

"پانی کا حساب کس بھاؤ سے لگایا جائے؟" کسی نے دریافت کیا۔

"پانی کی مہنگائی کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کہ تنخواہ یاب پہرے دار بٹھائے گئے ہوں۔ رتن کا تڑ میں تو سب نے مل کر ہی نگہبانی کی۔ خرچ تو اس سے لینا چاہیئے جو پہرے داری سے انکار کرتا۔ اللہ ڈنو تو گاؤں میں تھا ہی نہیں۔ اس سال وہ اپنی کسر پوری کر دے گا۔ لہٰذا یہی دام لگائے جائیں جو سب نے پچھلے دو سالوں میں ادا کئے" پیر صاحب نے اثبات میں ہلتے ہوئے سروں کے درمیان اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اللہ سائیں! بڑی خیر" اللہ ڈنو نے شکر اور احسانمندی کے جذبات سے کہا اور رقم گننے لگا۔ متارو کا منہ نکل آیا۔ قرضہ کی رقم اور دیگر واجبات سے زیادہ اسے کچھ نہیں ملا وہ کھسیانے پن سے

اپنا پگڑ درست کر رہا تھا۔

جنت گائے پا کر اتنی ہی خوش تھی جتنا اللہ ڈنو اپنے دو بیلوں سے۔ یہ دن بھر اپنے کھیت میں مست رہتا اور وہ اپنی کٹیا میں مگن۔ جنت نے دو بکریاں بھی پال لی تھیں۔ گائے اور بکریوں پر جان چھڑکتی۔ صبح ہوئی اور دونوں نے لسی سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ وہ کھیت کی طرف روانہ ہو جاتا اور جنت اپنے چوپائے لے کر دور ایک نئے ٹیلے کی طرف نکل جاتی۔ وہ مشکل سے اونچائی تلاش کرتی کیونکہ وہاں کی گھٹنے گھٹنے ہری گھاس کو کسی نے چھوا نہ ہوگا۔ انہیں اطمینان سے چرتا چھوڑ کر جنت گھر لوٹ آتی۔ دوپہر ہونے تک نمکین باجرے کی روٹی تیار کرتی۔ مکھن، لسی پیاز اور پانی لے کر وہ اللہ ڈنو کی طرف روانہ ہو جاتی۔ ایسے میں وہ ایک سندھی لوک گیت کی مجسم تصویر نظر آتی:۔

"میرے محبوب! تو اگر راضی ہو تو میں تیری رانی بن جاؤں
تجھے روٹی کے ساتھ مکھن لگا کر دوں گی۔
اور ہوا میں تنکا بن کر تیری آنکھوں میں بیٹھ جاؤں گی"۔

آدھا راستہ طے کرنے کے بعد وہ "ہو۔ ہو۔ ہو" کی آوازیں لگاتی۔ اللہ ڈنو کی جوابی آواز سن کر اسے اس کی جگہ کا پتہ چل جاتا اور وہ باجرے کی فصل کو چیرتے ہوئے اس تک پہنچ جاتی۔

"کتنی گھاس جمع کی؟" وہ پوچھتی۔

"اب کی بار گھاس بہت ہے۔ اکھیڑتا ہوں پھر اگ جاتی ہے لیکن فصل کو زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا"۔

"خدا کرے ابکی بار ہمیں شہر جانا نہ پڑے۔ میں بھی تمہارے ساتھ گھاس اکھیڑ دوں گی"۔

"اگر یہ فصل پوری کی پوری ہاتھ لگ گئی تو کبھی نہیں جاؤں گا۔ سال بھر کا غلہ رکھ کر ہم تین گائیں آسانی سے خرید سکتے ہیں"۔

"کیا چارہ کافی ہو جائے گا؟"

"چارہ تو پانچ جانوروں کا نکل سکتا ہے۔ دیکھتی نہیں فصل تیرے سر کو چھو رہی ہے"۔

"تو باقی گھاس میں ہم اپنی جھونپڑی درست کر لیں گے"۔ جنت مستقبل کے نقشے بناتی۔

"ہاں۔ ہاں۔ ضرور"۔ وہ کھاتے ہوئے انبساط و مسرت سے سر ہلاتا۔

شام تک دونوں کام کرتے۔ اللہ ڈنو گھر جھکا کے کمان بن جاتا اور گھٹنوں کدال سے گھاس اکھیڑتا۔ جنت اس کے پیچھے اکھڑے ہوئے ڈھیلوں سے لمبی گھاس جمع کرتی تاکہ ان سے اپنی کٹیا کے سوراخ بند کر سکے۔ پھوس کی دیواروں کو گھاس کا پیوند ہی تو چاہئے۔ ریگستان میں برسات کا سورج کم گرم نہیں ہوتا۔ اللہ ڈنو کے ریلے چھوٹ جاتے، کدال کی ہتھی پسینہ سے گیلی ہو جاتی اور وہ بار بار اپنے ہاتھ گرم ریت میں گھسیٹ کر خشک کرتا اور پھر کدال چلنے لگتی۔ جب وہ پسینہ خشک کرنے کے لئے بیٹھتا تو جنت اس کے لئے تربوز توڑ لاتی۔ مکا مار کر اس میں سوراخ کر دیتی اور تربوز کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیتی۔ پانی پی چکنے کے بعد اس کے دو حصے کر دیتی۔ ایک اپنے لئے اور ایک اللہ ڈنو کے لئے۔ دونوں خوب کھرچ کھرچ کر کھاتے، ایک دوسرے پر چھلکے پھینکتے اور سستا کر پھر دھرتی کا سینہ چیرنے لگ جاتے۔ جونہی سورج ریت کے پہاڑ نما ٹیلوں کو چومنے لگتا جنت کھیت چھوڑ کر مویشی لانے کے لئے نکل پڑتی۔ اللہ ڈنو دن بھر کی گھاس سر پر اٹھائے اس کے ساتھ ہوتا۔ ٹیلوں پر اترتے چڑھتے، اپنی زندہ دولت لئے، شام کے گجر کے ساتھ اپنے گھر پہنچتے۔ کام کاج کی تقسیم رضاکارانہ طور پر ہوتی۔ جنت نان خبینہ کا اہتمام کرتی اور اللہ ڈنو مویشی باندھ کر، دودھ دوہ کر، حقہ تیار کر لیتا۔ کٹیا کے باہر چھٹکی ہوئی چاندنی میں اپنی لہلہاتی کھیتی کی طرف رخ کئے امیدوں کے تانے بانے بنتے ہوئے دونوں محو خواب ہو جاتے۔ کون جانے ان دلوں میں کیسی کیسی آرزوئیں پلتی ہوں گی۔ لیکن ان کی تمناؤں کی شادابی زمین کی سرسبزی سے وابستہ رہی ہے، شاہ لطیف نے ان کے دلوں کو پا لیا تھا۔ تبھی تو دعا فرماتے ہیں:۔

"میرے مولا! سندھ پر کرم کی نظر کیجو
اے دوست! اے دلدار! سارے عالم کو شاداب رکھیو!"

اونٹ کی دہاڑ، تھلے جنت کا انتظار کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں اب بھی جنت کی دردناک آواز گونج رہی تھی۔

"گھوڑا رے! گھوڑا رے!" جنت کی ہائے ہائے سن کر وہ جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

"ٹکڑے۔ ٹکڑے۔ گھوڑا رے!" جنت اکا دکا اڑتی ہوئی ٹڈیوں کی

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

افسانہ:۔

"اپنا گھر"

انور عنایت اللہ

رضیہ کو کئی گھنٹوں کی مسلسل بےچینی کے بعد نیند آئی تو ذکیہ نے چپکے سے روشنی گل کر دی، دریچے بند کر دیئے، بھاری مخملی پردہ کھینچا اور پھر کمرے سے باہر آ گئی۔

ڈرائنگ روم کی گھڑی ایک بجا رہی تھی اور رات بےحد خاموش تھی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ نے شاہد کو بری طرح تھکا دیا تھا اور اب اسی کے اصرار پر وہ سو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں تاریکی تھی لیکن اس سے ملحق برآمدے میں روشنی تھی۔ میز پر نئے مکان کے نقشے اب بھی یوں ہی پڑے تھے۔ صبح وہ اور شاہد بیٹھے ان نقشوں کا مطالعہ کر رہے تھے کہ یکایک انہیں ایک چیخ سنائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر باہر آئے تو انہیں رضیہ نظر آئی جو سیڑھیوں سے قریب خون میں نہائی گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ وہ حسب عادت بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ اس کا پیر پھسلا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ بچ جائے گی لیکن شاید عمر بھر کے لئے اس کے داہنے پیر میں نقص رہ جائے۔

ذکیہ نے میز کا سہارا لے کر ٹھنڈا سانس لیا۔ یہ پچھلے چند گھنٹے قیامت کے گذرے تھے۔ وہ بری طرح نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے سارے نقشے سمیٹے اور انہیں ایک بار پھر الماری میں بند کر دیا۔ جب تک رضیہ مکمل طور پر صحتیاب نہیں ہو جاتی انہیں الماری ہی میں بند رہنا ہوگا۔ ذکیہ نے سوچا اور وہ برآمدے کی روشنی گل کر کے دوبارہ رضیہ کے کمرے میں لوٹ آئی۔ نئے مکان کے یہ نقشے پچھلے سولہ سال سے یوں ہی بنتے اور الماری میں بند ہوتے رہے تھے۔

آج رضیہ سے قریب صوفے پر نیم دراز لیٹ کر، آنکھیں بند کئے ذکیہ کو وہ دن شدت سے یاد آیا جب پہلی بار شاہد کے سینے سے لگ کر آنکھیں بند کئے سکون اور آسودگی کا ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے آہستہ سے شاہد کو یقین دلایا تھا کہ اسے بھی شاہد سے بےانتہا محبت ہے۔ اسی دن پہلی بار ایک ایسے ہی مکان کا نقشہ اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ ان کی شادی اب سولہ سال ہو رہے تھے۔

شاہد ایک فوجی باپ کا بیٹا تھا جس کی کوٹھی میں آجکل یہ لوگ مقیم تھے۔ شادی کے وقت کرنل واجد زندہ تھے۔ ان کا تو ابھی پچھلے سال انتقال ہوا تھا۔ بڑے وضع دار اور زمانہ شناس بزرگ تھے۔ شادی کے بعد ذکیہ دلہن بن کر اسی کوٹھی میں آئی تھی۔ یہ دو منزلہ کوٹھی تھی تو قدیم وضع کی، لیکن کرنل واجد کافی خوش ذوق انسان تھے۔ انہوں نے اپنے انجینئر بیٹے کی مدد سے اس میں بہت سی تبدیلیاں کر کے اسے خوبصورت اور آرام دہ بنا لیا تھا۔ چونکہ وہ گٹھیا کے مریض تھے اس لئے ان کی خوابگاہ نچلی منزل پر ہی تھی۔ انہوں نے دوسری منزل کی سب سے خوبصورت خوابگاہ بہو بیٹے کے حوالے کر دی تھی۔ کوٹھی سے ملحق باغیچہ تھا جس کی بہت اچھی طرح سے دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی بڑی کھڑکی سے باغ کی حسین ہری ہری روشیں بےحد بھلی لگتیں، جن سے ذرا پرے ایک حسین فوارہ تھا۔ شادی کے بعد اس خاموش کوٹھی میں منتقل ہو کر ذکیہ نے ایک عجیب سکون محسوس کیا تھا۔ لیکن چند ہفتوں کے قیام کے بعد باپ بیٹے بہو کے لئے شہر میں ایک خوبصورت فلیٹ کرایہ پر لے دیا جو شاہد کے دفتر سے قریب تھا۔ دونوں اپنی ایک علیحدہ خوبصورت دنیا میں منتقل ہو گئے جہاں ان کی آزادی میں مخل ہونے والا کوئی نہ تھا۔

اس فلیٹ میں منتقل ہونے کے فوراً بعد، ذکیہ کو ایک بار پھر اپنے گھر کی آرزو ہوئی تھی اور صرف اسی آرزو سے متاثر ہو کر شاہد نے شہر کے مضافات میں زمین خریدی تھی۔ اسی فلیٹ میں گھنٹوں دونوں اپنے نئے گھر کے نقشے تیار کرتے، اسکیمیں بناتے بحثیں کرتے اور ان دلچسپ باتوں کے دوران مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھو جاتے۔

کئی دنوں کی محنت اور بحث مباحثے کے بعد کوٹھی کا پہلا نقشہ تیار ہوا تھا۔ بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ بارشوں کے فوراً بعد گھر کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ یکایک گھر کی تعمیر میں پہلی رکاوٹ پیدا ہوئی۔

ایک دن شاہد خلاف معمول وقت سے پہلے ہی دفتر سے لوٹ آیا تو ذکیہ پریشان ہو گئی۔ شاہد کا چہرہ قدرے اترا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی اداسی سے اپنی فیلٹ ایک طرف رکھ دی اور آہستہ سے اسے یہ بری خبر سنائی تھی کہ اس کی ملازمت جاتی رہی۔ جنگ کے خاتمے پر تمام محکموں میں تخفیف ہو رہی تھی اور وہ اسی تخفیف کا شکار ہو گیا تھا۔

کرایہ کا فلیٹ چھوڑ دیا گیا اور دونوں ایک بار پھر کرنل واجد کے یہاں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ نئے مکان کے نقشے پہلی بار الماری میں بند کر دیئے گئے اور ملازمت کی تلاش شروع ہو گئی۔

دو مہینوں کے اندر اندر شاہد کو ایک بڑی فرم میں ملازمت مل گئی تنخواہ کچھ کم تھی لیکن مستقبل میں ترقی کی امید تھی۔ ایک بار پھر نئے گھر کے نقشے تیار ہونے لگے۔ شاہد اپنے باپ سے روپے لینے کے حق میں نہیں تھا۔ پہلے تو امید تھی کہ حکومت سے قرض مل جائے گا۔ اب وہ امید بھی جاتی رہی تھی۔ پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ پچھلے نقشوں کے مطابق مکان تیار ہوتا۔ اس لئے شاہد نے ایک اور نقشہ تیار کیا۔ ایک بار پھر ایک نئے گھر کے خواب دیکھے جانے لگے۔ دونوں کو کرنل واجد کے یہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ باپ کو اپنے اکلوتے بیٹے سے بڑی محبت تھی۔ بہو نے اپنے سگھڑاپے سے خسر کا دل موہ لیا تھا۔ خود ذکیہ کو کرنل واجد بہت پسند آئے۔ وہ ہر بات میں بہو کی رائے کو اہمیت دیتے، اس سے مشورے لیتے اور ہمیشہ وہی کرتے جو ذکیہ کو پسند ہوتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود، ذکیہ کے دل میں ایک علیحدہ گھر کی آرزو پرورش پاتی رہی۔ نقشے تیار ہو گئے تو اس نے شاہد کو راضی کر لیا کہ وہ تعمیر کا کام اپنی نگرانی میں فوراً شروع کر دے۔

ٹھیکہ داروں سے ساری باتیں طے ہو گئیں اور کام شروع ہونے میں چند ہی دن رہ گئے تھے کہ یکایک اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ دو ایک دن تو اس نے شاہد سے یہ سب کچھ چھپا رکھا لیکن تا کجے؟ طبیعت روز بروز بگڑتی گئی۔ بوڑھے کرنل نے پریشان ہو کر فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور ڈاکٹر نے لیڈی ڈاکٹر کو۔ لیڈی ڈاکٹر نے پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد چپکے سے شاہد کے کان میں مبارکباد دی ——

جب کافی علاج کے بعد بھی ذکیہ کی طبیعت نہیں سنبھلی اور سخت گرمیاں شروع ہو گئیں تو بیوی کی خاطر شاہد نے رخصت لی اور دونوں پہاڑ چلے گئے اور نئے مکان کا نقشہ ایک بار پھر الماری میں بند کر دیا گیا۔

اسی طرح یہ نقشہ بنتا اور بگڑتا رہا اور اب تو شادی کو سولہ سال ہو رہے تھے۔ ان کی پہلی لڑکی رضیہ اب پندرہ سال کی تھی اور آج صبح بری طرح سے زخمی ہو کر نیم بیہوش پڑی تھی۔ اس کا دوسرا بچہ حامد اب چودہ سال کا تھا اور نویں میں پڑھ رہا تھا۔ کرنل واجد کا انتقال ہو گیا تھا اور اب شاہد اپنی فرم میں چیف انجینئر تھا۔ اس کے بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو گئے تھے اور ذکیہ کے سر میں بھی کئی سفید بالوں کی لٹیں ابھر آئی تھیں۔ اب تک وہ کرنل واجد ہی کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ نیا مکان بن جائے تو اسے فروخت کر دیں۔ کئی سال کے بعد اب شاہد نے ایک بار پھر بڑی محنت سے نئے مکان کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اب تو اس نے وہ پرانی زمین فروخت کر کے، شہر کی ایک نئی ابھرتی ہوئی کالونی میں ایک بڑا پلاٹ خرید لیا تھا۔ آج صبح وہ اس نئے نقشے کے متعلق ہی خوشی کے قہقہوں کے درمیان بحث کر رہے تھے کہ یکایک انہیں رضیہ کی چیخ سنائی دی تھی۔

رضیہ نے بے چینی سے کروٹ لی تو اس کے منہ سے ہولے سے آہ نکل گئی۔ شاید وہ اب ہوش میں آ رہی تھی اس کی کراہ سے ذکیہ چونک گئی، اس نے اٹھ کر رضائی درست کی اور جھک کر غور سے اسے دیکھا۔ اس کا سر اور چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں اور چہرہ زرد۔ ذکیہ نے فرطِ محبت سے بے چین ہو کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو بری طرح تپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی ٹھنڈک شاید رضیہ کو بھلی لگی اور اس کے ہونٹ آہستہ سے کھلے۔ "مجھے سونے دو حامد —— سونے دو، تمہاری شرارتوں سے میں تنگ آ گئی ہوں۔ آنے دو ابو کو —— امی کے لاڈ نے تمہیں بگاڑ رکھا ہے۔" وہ بڑبڑائی اور ذکیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے —— "سو جا میری بچی آرام سے سو جا۔ میں حامد کی ڈٹپائی کروں گی کہ ساری شرارتیں بھول جائے گا۔" وہ زیر لب بولی۔ یوں جیسے واقعی رضیہ ہوش میں ہو اور اس کی باتیں سن رہی ہو —— اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور نہ جانے کب تک وہ یوں ہی بیٹھی روتی رہی۔

یکایک اس نے اپنے شانے پر شاہد کا ہاتھ محسوس کیا تو سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ شاید وہ بھی سو نہ سکا تھا۔

"یہ کیا؟ خدا کے لئے ہمت سے کام لو۔ ہماری بچی اب بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ صبح تک دونوں یوں ہی بچی کے سرہانے بیٹھے خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتے رہے۔ صبح کی روشنی کے ساتھ رضیہ کی طبیعت سنبھلنے

گئی اور آٹھ بجے تک وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گئی۔ نو بجے ڈاکٹر نے اس کا ایک بار پھر معائنہ کیا اور ذکیہ کو تسلی دی کہ اس کی بچی خطرے سے باہر ہے۔ "زخم جلد اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن شاید داہنے پیر میں نقص رہ جائے کیونکہ ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ابھی لڑکی کافی دن اسے بستر ہی میں رہنا ہوگا۔" اس نے جاتے ہوئے آہستہ سے شاہد سے کہا۔

ڈاکٹر چلا گیا تو ذکیہ نڈھال سی ہو کر بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور نہ جانے کب تک یوں ہی بیہوش سوتی رہی۔ نیند میں اس نے بے شمار خواب دیکھے۔ بار بار وہ حسین کوٹھی اس کے سامنے آتی رہی جس کی شادی کے بعد سے اسے بڑی آرزو تھی جس کے پچھلے پندرہ سولہ سال میں کئی نقشے بنے اور بگڑے۔ ان حسین خوابوں کے درمیان یکایک اسے رضیہ کی چیخ سنائی دی جو اوپر جاتے ہوئے سیڑھیوں پر سے نیچے لڑھک کر آ رہی تھی اور خون میں نہائی ہوئی خاموش گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ رضیہ کی چیخ کے ساتھ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

چار بج گئے تھے اور اب دن ڈھل رہا تھا۔ آسمانوں پر کالے بادل چھا گئے تھے جس سے کمرہ قبل از وقت نیم تاریک ہو گیا تھا اس نے تھکی تھکی سی انگڑائی لی۔ رضیہ کے کمرے سے اب اسے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے آوازیں پہچاننے کی کوشش کی۔ شاہد کچھ کہہ رہا تھا چند لمحوں کے بعد حامد کی آواز آئی۔ اور پھر یکایک رضیہ کی دھیمی سی آواز آئی۔ اس کی آواز سن کر ذکیہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

وہ اس کے کمرے میں پہنچی تو رضیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"کیا حال ہے میری بچی؟" وہ اس کے قریب تپائی پر بیٹھ گئی۔

"اچھی ہوں۔ صرف پیر میں سخت درد ہے۔" رضیہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے قریب شاہد بیٹھا تھا اور اس کے سامنے نئے گھر کا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ حامد اس پر جھکا ہوا غور سے اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"ہم بڑی دیر سے باتیں کر رہے ہیں ذکیہ۔ تم بے خبر سو رہی تھیں اس لئے میں نے جگایا نہیں۔" شاہد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر آیا تھا؟" ذکیہ نے رضیہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں آیا تھا۔ اب بخار کم ہے۔ ایک آدھ ہفتے میں انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔" شاہد نے تسلی دی۔

"لیکن شاید میں کافی عرصے تک چل پھر نہ سکوں۔ ڈاکٹر سے میں نے پوچھا تو انہوں نے گول سی بات کر دی۔ مجھے معلوم ہے امی۔ میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" رضیہ آہستہ سے بولی۔ اس پر شاہد نے مڑ کر کہا۔

"ہڈی وڈی نہیں ٹوٹی بیٹی۔ بس ذرا زیادہ چوٹ آ گئی ہے۔ کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ہاں ذکیہ۔ تمہارے آنے سے پیشتر ہم اپنے نئے گھر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔" شاہد نے فوراً موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اس کا فوراً خاطر خواہ اثر ہوا۔

"مجھے یہ پسند نہیں آیا امی۔ ویسے اچھا ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا لگا۔" رضیہ بولی۔ "میں اس میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہوں امی۔ میرا کمرہ بالکل ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ یہاں ہے۔ یعنی کہ مکان کے دائیں حصے میں باغیچے کے ساتھ تاکہ میرے ہوائی جہاز کے کارخانے کے لئے گنجائش نکل سکے لیکن ابا راضی نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں، یہ تبدیلی کی گئی تو گھر کا نقشہ یعنی اس کی صورت بگڑ جائے گی۔" حامد نے بھی فوراً شکایت کی۔

"اور میرا کمرہ دوسری منزل پر ہے امی۔ میں آئندہ کبھی دوسری منزل تک جا بھی سکوں گی؟" رضیہ بولی اور یکایک شاہد کا چہرہ اتر گیا اور ذکیہ نے چونک کر شاہد کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

"مجھے علی الصباح طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی بہت بھلی لگتی ہے۔ اسی لئے مجھے اپنے اس کمرے کی بڑی کھڑکی بے حد پسند ہے۔ میرے کمرے میں ایسی ہی کھڑکی ہوگی نا ابو؟" رضیہ نے شاہد سے پوچھا۔ اور شاہد نے سوچا۔ اتنی بہت سی تبدیلیاں ممکن بھی ہیں؟ نئے نقشے میں تو ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس نے بچوں کے اعتراضات سن کر غور سے نقشے کا ایک بار پھر جائزہ لیا تو اسے پہلی بار یوں محسوس ہوا جیسے واقعی اس میں بہت ساری خامیاں رہ گئی تھیں۔ اسے ہمیشہ سے ایک علیحدہ لائبریری کی آرزو تھی، لیکن اخراجات، کم کرنے کی خاطر اس نے عمداً اس نقشے میں ڈرائنگ روم اور لائبریری کے لئے ایک ہی بڑا سا کمرہ وقف کر رکھا تھا۔ اب بچوں کے اعتراضات سن کر نہ جانے کیوں صرف ایک لمحہ کے لئے اس کا جی چاہا

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

پشتو رومان:

شیرو زغزالہ (۳)

احمد فراز

نغمہ و رقص کے وسیلے سے
خود غرض داورس کے دامن میں
رہی دن رات ہُن ہی برساتی
اور غزالہ نئی امیدوں پر
رقص کرتی رہی، تھرکتی رہی
گیت گاتی رہی، تڑپتی رہی

غزالہ

تجھ بن کالی رین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
تڑپ تڑپ کر گھڑیاں بیتیں پل پل برسے آگ
کوئی ہنسے اور کوئی روئے اپنے اپنے بھاگ
ہم کو نہ آئے چین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
جیون دکھ کی قید میں بیتا اب سکھ کی کیا آس
جی کو جلائے چپ تنہائی کوئی نہ آئے پاس
نیر بہائیں نین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
چاروں اور اندھیارے برسیں ڈوبے تارے چاند
آشاؤں کا اک اک دیپک پڑنے لگا ہے ماند
گیت بنے ہیں بین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین

ایک شب داورس نہ تھا گھر پر
اور غزالہ اداس بیٹھی تھی
اپنے ماضی کے واقعات میں گم
گم جہانِ تصورات میں گم
کہ اچانک فضا میں لہرائی
ایک مانوس اجنبی آواز!

آواز—

تیرے نگر میں آئیں مسافر
پگ پگ ٹھوکر کھائیں
گھور اندھیروں کی دنیا میں
تیرا کھوج نہ پائیں

جب غزالہ نے یہ سنی آواز
یوں اچانک تڑپ اٹھی جیسے
خواب سے کوئی چونک اٹھتا ہے
ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی
آنے والی صدا کی سمت چلی
نیند میں جیسے کوئی چلتا ہے
جیسے بجھتا چراغ جلتا ہے

شمروز: آخر کار میرے دل کی فغاں
کھینچ ہی لائی تم کو جانِ جہاں!
کیا کہوں تیرے انتظار کے دن
کس قدر کرب ناک تھے لیکن
جی رہا ہوں کہ میری جان ہو تم
میری دنیا مرا جہان ہو تم

. . . .

مجھ سے مل کر اداس کیوں تم ہو؟
چپ ہو کیوں کس خیال میں گم ہو؟

غزالہ: کیا بتاؤں تمہیں مرے شمروز!
جی جلاتا ہے اک نہ اک غم روز
میں ترے پاس بھی ہوں دور بھی ہوں
خوش بھی ہوں، درد و غم سے چور بھی ہوں
کتنی ویراں ہے رہگزارِ حیات!
چاندنی ہے کہ آگ کی برسات!

شمروز: جانے کیا غم ستا رہا ہے تمہیں
کونسا روگ کھا رہا ہے تمہیں
چند لمحوں کی یہ ملاقاتیں
یہ فضائیں یہ چاندنی راتیں
بیت جائیں تو پھر نہیں آتیں
کاش! تم دل کے بھید پا جاتیں
زندگی دو دلوں کے میل کا نام
مسکراؤ کہ دور ہیں آلام

غزالہ: یہ نظارے، یہ چاند، یہ تارے
بس فریبِ نگاہ ہیں سارے
گلستانوں میں، مرغزاروں میں
کوہساروں میں، آبشاروں میں
سخت کانٹوں میں، نرم پھولوں میں
تند موجوں، سُبک بگولوں میں
رقصِ شعلہ میں، رنگِ شبنم میں
مختصر یہ کہ سارے عالم میں
دل کی کیفیتوں کے آئینے
رکھ دیئے ہیں نظر فریبی نے
دل ہو گر خوش تو ظلمتیں بھی چراغ
دل حزیں ہو تو ماہتاب بھی داغ
جتنی رنج و خوشی کی باتیں ہیں
مختلف دل کی وارداتیں ہیں
ایسے عالم میں سکھ کی کیا اُمید

شمروز: خیر تم بے سبب ہو نا اُمید
گردشیں جب چلن بدلتی ہیں
گل شدہ مشعلیں بھی جلتی ہیں

. . . .

ہاں غزالہ وہ داورَس کی سناؤ
کیا ہوئی اس سے کوئی بات بتاؤ

غزالہ: وہ مری ہر خوشی پہ غالب ہے
مجھ سے وہ سیم و زر کا طالب ہے
مجھ سے وہ عہد کر چکا ہے سجن!
اور میں دے چکی ہوں اس کو وچن
کہ مری ذات کی بدولت اگر
جمع کر لے وہ اتنا سیم اور زر
جس سے وہ زندگی سنوار سکے
رات دن چین سے گزار سکے
تو وہ مجھ کو کبھی نہ روکے گا
میں جدھر جاؤں وہ نہ ٹوکے گا
شرط مشکل ہے گو رہائی کی
پھر بھی تو آس ہے رہائی کی

شمروز: گر تمہیں اس کے قول پر ہے یقیں
فکر کرنے کی پھر تو بات نہیں
داورَس گر وچن پہ قائم ہے
اپنے عہدِ کہن پہ قائم ہے
تو یہ لو سیم و زر کی تھیلی ہے
جو اُسے عمر بھر کو کافی ہے

غزالہ: نہیں شمروز یہ نہیں ممکن
تم مری زندگی سہی لیکن
یہ گراں بار میں اُٹھاؤں گی
خود ہی اپنا وچن نبھاؤں گی
میرا دُکھ اپنے سر نہ لے کوئی
کیوں مری آگ میں جلے کوئی
کچھ دنوں کے ستم ہیں، یہ بھی سہی
جس طرح اور غم ہیں، یہ بھی سہی

شمروز: کیا مجھے غیر تم سمجھتی ہو؟
کس لئے مفت میں اُلجھتی ہو؟
اب یہ ضد چھوڑ دو مری مانو
دوستوں دشمنوں کو پہچانو
جاؤ اس دھن کو کام میں لاؤ
وقت کی پیشکش نہ ٹھکراؤ
یہ تمہارے لئے ہی لایا تھا
آج میں عہد کر کے آیا تھا
کہ میں اس داورس لٹیرے کو
رام دھن سے کروں گا پہلے تو
اور یوں بھی اگر نہ وہ مانا
پھر اسے یا مجھے ہے مر جانا

غزالہ: نہیں ایسا نہ تم کہو شمروز!
تم سلامت سدا رہو شمروز!
گر یہی فیصلہ تمہارا ہے
تو مجھے موت بھی گوارا ہے!
اچھا چلتی ہوں، تم یہیں ٹھہرو

(گھوڑے کی ٹاپ سنائی دیتی ہے
داورس غزالہ کو پکارتے ہوئے
قریب آجاتا ہے)

داورس آرہا ہے، چھپ جاؤ!

. . . .

داورس:— ہوں! تو یہ آدھی آدھی راتوں کو
فاحشہ! کس سجن سے ملتی ہو؟
بد چلن! دھوکہ باز! مکّارہ!
تجھے اپنا وچن بھی یاد نہ تھا

غزالہ: داورس تم ذرا مری بھی سنو
کیا تم اپنے وچن پہ قائم ہو؟

داورس: ہوں، مگر تم سی بدزبان سہاگن
جس کو اپنی قسم کا پاس نہیں
میں وفا کس لئے شعار کروں
سچ! میں تجھ پہ اعتبار کروں؟

غزالہ: تم کو ناحق ہوا ہے مجھ پہ شبہ
اب بھی ہے عہد استوار مرا
یہ لو تھیلی، مری ضمانت ہے
مرے عہدِ کہن کی قیمت ہے
اور اب تم بھی اپنا قول نبھاؤ
حسبِ وعدہ مجھے نہ اور ستاؤ

داورس: اتنی دولت! کہاں سے لائی ہو
سچ کہو کس کے ہاں سے لائی ہو؟

غزالہ: اس سے کیا تم کو چاہیے جو کچھ ہو
تم کو دھن سے غرض تھی وہ یہ لو

داورس: ہوں! یہ زیور، یہ سیم و زر، یہ گہر
ٹھیک ہے یہ مری طلب تھی مگر
زندگی اس کے ماسوا بھی ہے
خواہشِ حسنِ دلربا بھی ہے
خواہشِ زر تو اک بہانہ تھا
مطلب اپنا تمہیں بتانا تھا

غزالہ: او کمینے! ذلیل! وعدہ شکن!
اس قدر بھی نمک حرام نہ بن
تیرا باطن نہ چھپ سکا آخر
مرد اگر ہے تو بات سے مت پھر

داورس: یہ ادائیں بھرے شباب کے ساتھ
پیاری لگتی ہو کچھ عتاب کے ساتھ

یہ جواں جسم، یہ شباب حسیں
میری دولت ہے میری ماہ جبیں!
تم کہیں اور جا نہیں سکتیں
مجھ سے دامن چھڑا نہیں سکتیں

شمروز: (سامنے آتا ہے)
چپ رہو! بدزباں ضمیر فروش!!
ایک عورت کے سامنے یہ خروش!
مرد اگر ہو تو سامنے آؤ
دست و بازو کا زور دکھلاؤ

داورس: اچھا! یہ وہ رئیس زادے ہیں
کہو اے دوست! کیا ارادے ہیں؟

شمروز: فیصلہ تم سے بدشعاروں کا
جن سے اجڑا ہے گھر ہزاروں کا
لو یہ خنجر ہے، سامنے آؤ
تم غزالہ! پرے چلی جاؤ

داورس: نوجواں! یہ جنوں نہیں اچھا
بے سبب قتل و خوں نہیں اچھا
کیوں دلوں میں کدورتیں بھر لیں
آؤ ہم تم مفاہمت کر لیں

شمروز: کس سے؟ ہم سے مفاہمت! کیا خوب
کبھی یکجا ہوئے شمال و جنوب؟

داورس: ہے عبث زعم زندگانی پر
تم تو مغرور ہو جوانی پر
پھینکو خنجر، نہ اتنا دم کرو
کچھ جوانی پہ اپنی رحم کرو
باہر آؤ نہ اپنے آپے سے
خوف کھاؤ مرے بڑھاپے سے

شمروز: خیر باتوں سے اب نہ دھمکاؤ
جو بھی ہونا ہے، ہونے دو، آؤ

داورس: ٹھہرو! یہ فیصلہ غزالہ کرے
چاہے کوئی جئے کہ کوئی مرے
وہ جسے چاہے اس کی ہو جائے
دکھ نہ ہوگا جسے بھی ٹھکرائے

شمروز: جو کہے گی وہ ماننا ہے منظور

داورس: مجھ کو منظور ہے...... تمہیں؟

شمروز: منظور

غزالہ: مجھے شمروز سے محبت ہے

داورس: ٹھیک ہے اپنی اپنی قسمت ہے

شمروز: تم سمجھتے اگر تو پھر کیا تھا

داورس: میں غزالہ کو آزماتا تھا
گو اسے مجھ سے رابطہ کم ہے
مجھ کو اس کی خوشی مقدم ہے
جاؤ اب تم خوشی سے بیاہ کرو
تاقیامت جیو، نباہ کرو

غزالہ: سچ! مرے اچھے داورس، بابا!

داورس: اب بھی تم کو یقیں نہیں آتا
آؤ شمروز میرے پاس آؤ
آخری بار اب گلے لگ جاؤ

شمروز: (گلے ملتے ہوئے) تم بھی مجھ کو معاف کر دینا

(داورس خنجر بھونک دیتا ہے)

داورس: اپنے کرتوت کا صلہ لینا

شمروز: (کراہتے ہوئے) آہ!

غزالہ: شمروز....

داورس قہقہہ لگاتا ہے

شمروز: آہ! دھوکہ..... آہ!

غزالہ: بزدل انساں نے اوچھا وار کیا

شمروز: دھندلی سی جم رہی ہے آنکھوں میں
روشنی کم رہی ہے آنکھوں میں
تم غزالہ کہاں ہو؟ پاس آؤ
آخری بار منہ تو دکھلاؤ

غزالہ: میں تمہارے قریب ہوں جانم!

شمروز: کتنا پیارا ہے موت کا.... عالم!
مرتے دم تم بھی ہو قریب مرے

غزالہ: داغِ فرقت نہ دو حبیب مرے

شمروز: پھیلتا جا رہا ہے سایہ سا
اب تو کچھ بھی نظر نہیں آتا
الوداع... الوداع... جانِ مری!

داورس: تم ہو میری متاع، جانِ مری!
زخم رونے سے بھر نہیں جاتے
جانے والے کبھی نہیں آتے
سرد لاشوں سے کچھ نہیں ملتا
پھول مرجھا کے پھر نہیں کھلتا
آؤ زندہ دلوں کو پیار کرو
جینا سیکھو، خوشی شعار کرو

غزالہ: میں غمِ مرگ سے نہیں ڈرتی
اس لئے دل بُرا نہیں کرتی
جو غرض آشنا نہیں ہوتے
مر کے بھی وہ جُدا نہیں ہوتے
پھول مٹ جائیں بُو نہیں مٹتی
موت سے آرزو نہیں مٹتی
یہی خنجر لہو پیا جس نے
قتل شمروز کو کیا جس نے
اب مرا درد بھی مٹائے گا
مجھ کو شمروز سے ملائے گا!

(غزالہ خنجر فضا میں لہراتی ہے)

داورس: (خوفزدہ ہوکر) ٹھہرو! کیا کر رہی ہو، سوچو تو
کس لئے مر رہی ہو، سوچو تو

غزالہ: زندگی بے حبیب ننگِ طلب
مرگ با دوستاں ہے جشنِ طرب

داورس: خودکشی تم نہ کر سکو گی کبھی
میرے ہوتے نہ مر سکو گی کبھی
مجھے تم سے تو کوئی بیر نہیں

(خنجر کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

غزالہ: چھوڑو خنجر، وگرنہ خیر نہیں
اپنے ہاتھوں کو دور ہی رکھو

داورس: یہ نہ ہوگا.........

غزالہ: تو پھر مزہ چکھو

داورس: (کراہتے ہوئے) آہ! تو مارِ آستیں نکلی

غزالہ: آج حسرت مری کہیں نکلی
اب مروں گی کہیں سکون کے ساتھ
شکھ ملا داورس کے خون کے ساتھ
اب بھٹکتی نہیں نگاہ مری
میرے شمروز! دیکھ راہ مری

(خنجر سینے میں پیوست کر دیتی ہے)

(دم توڑتے ہوئے)

زندگی بے حبیب ننگِ طلب
مرگ با دوستاں ہے جشنِ طرب

دور ان سرمئی پہاڑوں سے
ریگزاروں کی سرحدوں سے پرے
ایک سنسان سا خرابہ ہے
جس کی پھیلی ہوئی خموشی میں
جب کبھی چاندنی نکھرتی ہے
گھنگھروؤں کی دبی دبی آواز
ایک نغمے کے روپ میں ڈھل کر
دفعتاً ہیز... چیخ اٹھتی ہے!

(گھنگھروؤں کی چھنک کے ساتھ
پس منظر سے آواز ابھرتی ہے)

پریت کے دکھ اپنا کر
ہم نے
کیا کھویا کیا پایا!

○

مرگِ شب

عبدالرؤف عروج

ہجومِ راہرواں — محوِ انتظارِ جرس
حدیثِ خوش نظراں — جلوہ ہائے چند نفس
سکوتِ شامِ غریباں، چمن سے تابہ قفس
مگر جبینِ تمدن پہ روشنی کی لکیر
اسی طرح سے ابھرتی ہے جگمگاتی ہے

بھٹکتی جاگتی راہوں کی صندلیں باہیں
ہجومِ راہرواں کے لئے کشادہ رہیں
لہو کی، گرد کی، طوفان کی رداؤں میں
چراغِ دیدہ و دل کی لویں بھی ڈوب گئیں

متاعِ ہوش لٹائیں بھی ہم تو کیا کہ ہمیں
بصد خرابیٔ جاں دلبروں کی راہ ملی
ملولِ شہرِ نگاراں، شکستہ خیمۂ گل
بہ اہتمامِ خلش، فرصتِ نگاہ ملی
ہر آفتاب کو ہم نے گلے لگایا تھا
ہر آفتاب سے ہم کو شبِ سیاہ ملی

جھپک رہی ہیں ستاروں کی نقرئی پلکیں
فضائیں گونج رہا ہے حسین سناٹا
اس آس پر کہ ہے نزدیک ہی دیارِ غزل
غمِ حیات نے اپنا کڑا سفر کاٹا

شہیدِ عشوۂ گلچیں، قتیلِ تیغِ نجات
ہر آرزو کی جوانی، ہر آرزو کی برات

جہانِ لالہ و انجم سے اٹھ رہا ہے دھواں
شمیمِ کوچۂ دلدار میں مہک بھی نہیں
یہ کون ساعتِ مایوس ہے کہ ہمسفرو
ہم اہلِ دل کو گمانِ بہار تک بھی نہیں
ہوائے سرد جہنم کی آنچ لاتی ہے
گلاب پیکر و شبنم سرشت نرم بدن
فروغِ شعلۂ سوزاں سے تلملاتے ہیں
ستیزہ کار اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں

ہمیں ہیں جلوہ فزائے حریمِ فکر و نظر
ہمیں ہیں نقش گرِ کائناتِ شام و سحر
ہمیں ہیں باعثِ شادابیٔ عروسِ بہار
ہمیں نے اپنے لہو سے چمن نکھارے ہیں
زبانِ راز ہیں ہم جیسے فرازِ رسن
ہمیں تو اس افقِ ناز کے ستارے ہیں
ہمیں ہیں لحنِ طرب زا، ہمیں ہیں شورِ فغاں
ہمارے ساز پہ تہذیب مسکراتی ہے

کسی سے بجھ نہ سکیں گے شگفتگی کے دیے
زمانہ بادِ صبا کو ہلاک کر نہ سکا
خزاں کے جور سے صبحِ بہار مر نہ سکی
ستم کا قافلۂ تیرگی ٹھہر نہ سکا
ہمیں یہ رات گراں رات کیوں ڈراتی ہے
کہ پھر جبینِ تمدن پہ روشنی کی لکیر
اسی طرح سے ابھرتی ہے جگمگاتی ہے

ثقافت:

اُچ

ایس فیروز

پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگم پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، کھجوروں کے جھنڈوں اور سبز لہلہاتے کھیتوں کے درمیان۔ یہ اُچ کا قدیم شہر ہے۔ اس خراب آبادی کی یادیں ہمارے دلوں کو عزیز ہیں، کیونکہ ہمارے کتنے ہی صاحب دل صوفیا و درویش اس خاک پاک میں آرامیدہ ہیں اور اس کا ہزارہا سالہ ماضی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اب تو یہ محض ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ دس ہزار گھر ہوں گے، وہ بھی خستہ و خراب۔ ٹیڑھی میڑھی، تنگ و تاریک گلیاں، جا بجا کوڑے کے ڈھیر، اونچی نیچی سڑکیں جن پر دھول اُڑتی رہتی ہے اور فضا وہی جو عام دیہات کی ہوتی ہے۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ یہ شہر سلطنت سندھ کا ایک عظیم و جلیل شہر اور پایہ تخت تھا اور اس کی آبادی ۳۶ میل لمبے اور ۲۴ میل چوڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ شہر سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز اور تجارت کا گڑھ تھا اور دریائی حمل و نقل کا ایک اہم جنکشن۔ اس کے علمی مراکز اور درس گاہوں کی ایک دنیا میں دھوم تھی، اسے چھاونی کی حیثیت بھی حاصل تھی اور یہاں ہمیشہ بڑی تعداد میں فوج کا پڑاؤ رہتا تھا۔ سر چارلس میسن، جو ۱۸۲۶ء میں اُچ آیا تھا، اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:

"یہاں سے غلے کی بھری ہوئی کشتیاں سندھ روانہ ہوتی ہیں۔ اپنی تاریخی یادگاروں اور قدیم آثار کے لئے یہ شہر مشہور ہے۔"

اس برعظیم میں چند ہی شہر ایسے ہوں گے جو انہیں قدامت یا تاریخی، ثقافتی اور مذہبی اہمیت میں اس کے حریف قرار دئے جا سکیں۔

اُچ ریاست بہاولپور کے مشرقی حصے میں احمد پور کی تحصیل میں واقع ہے۔ آپ کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کی بڑی لائن کے اسٹیشن ڈیرہ نواب صاحب پر اترنا پڑے گا۔ وہاں سے چودہ میل، بھٹے کی اینٹوں کی پختہ سڑک طے کر کے آپ اُچ پہنچ جائیں گے۔

اُچ کے باشندے زیادہ تر کاشتکار ہیں، وہ وہی قدیم اور سادہ وضع کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو انہیں اپنے اجداد سے وراثت میں ملی۔ کسانوں کے جھونپڑوں میں وہی مٹی کے تیل کی لالٹینوں یا کڑوے تیل کے چراغوں کی مدھم روشنی نظر آتی ہے، البتہ درگاہوں کے سجادہ نشینوں کے بنگلے بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کے لئے مشینیں بھی انہوں نے خرید رکھی ہیں۔

قدیم تاریخ:۔ اُچ نام کی توجیہیں تو آپ کو بہت ملیں گی لیکن غالباً سب سے زیادہ قابل قبول وہ ہے جو صاحب "تحفۃ الکرام" نے لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مقامی بولی میں اُچ اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ سہسی نام کے ایک راجہ نے اُچ کے باشندوں سے لگان کے بدلے یہ خدمت لی کہ وہ ان نواحات کو مٹی ڈھو کر اونچا کر دیں۔ حکم حاکم، اس سے ایک اونچے گھاٹ کی سی صورت پیدا ہو گئی۔

اُچ کا ذکر بھی پہلے پہل ہندوؤں کی داستانوں میں ملتا ہے، اور وہ اس عنوان سے کہ دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے دو قبیلوں — جاٹوں اور میروں میں لڑائی ٹھن گئی۔ انہوں نے راجہ دریودھن سے درخواست کی کہ آپ اپنی طرف سے کسی کو حاکم بنا کر بھیج دیجئے جو امن قائم کرے۔ راجہ دریودھن نے اپنی بہن

رانی دھسلا کو اس مقام کا حاکم مقرر کر دیا اور اس کی وجہ سے اُچ میں امن و خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔

اس کے بعد ہم کافند نامی بادشاہ کا ذکر سنتے ہیں جس کی قلمرو سارے سندھ اور بلوچستان پر محیط تھی۔ اسی بادشاہ کے دور میں ایران کے ساسانی شہنشاہ بہمن نے، جس کا ذکر فردوسی کے ہاں آتا ہے، سندھ پر یلغار کی۔ اس نے اس قلمرو کا ایک حصہ فتح کر کے وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا، لیکن راجہ کافند نے تھوڑے ہی عرصے بعد اسے زیر کر لیا۔ کافند کے بعد اس کا بیٹا اَہند سلطنت کا وارث ہوا۔ اس نے سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ جن میں سے ایک صوبہ اُچ کا تھا۔ اُچ پر بعد میں بھی اہل پارس اور تاتاریوں کی اکثر یورشیں رہیں، اور اس دور کے کچھ طلائی اور نقرئی سکّے حال ہی میں بہاولپور کے نواحات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اسکندر نے پنجاب سے جنوب کا رخ کیا اور ملتان کو فتح کیا تو اُچ کے راجہ نے فوراً اس کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن جب اسکندر کے لشکر نے اُچ کی طرف پیشقدمی کی تو راجہ نے مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اور اسکندر کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا۔ اس کے بعد اسکندر نے دریائے راوی اور چناب کے سنگم پر ایک نیا شہر تعمیر کیا اور اس کا نام اسکندریہ رکھا۔ کننگھم اور بعض دیگر ماہرین جغرافیہ کا خیال ہے کہ اسکندریہ وہیں واقع تھا جہاں آج کا اُچ آباد ہے۔ جب اسکندر اپنے ملک واپس چلا گیا تو مقامی راجوں اور سرداروں نے بغاوت کر دی اور مقدونی گورنر کو تیغ کے گھاٹ اتار کر اپنا تسلط جما لیا۔

عربوں کے حملے سے پہلے کے دور میں سب سے اہم حکمران، جس کا نام ہم سنتے ہیں، راجہ دیو راج تھا جس کا پایہ تخت موجودہ روہڑی کے قریب الور میں تھا۔ صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں کہ اس راجہ کے چار جانشینوں نے تقریباً ۱۳۷ سال تک سندھ کو زیر نگیں رکھا۔ ان کے نام یہ ہیں: راجہ سہاسی، راجہ سہاسی، سہارس دوم اور سہاسی دوم۔ معلوم ہوتا ہے کہ سہارس دوم لوگوں میں بہت مقبول تھا کیونکہ لوک گیتوں اور عوامی کہانیوں میں اس کا نمایاں ذکر ملتا ہے، اور اس کے انصاف اور فیاضی کے قصے مشہور ہیں۔ چچ نامہ ہی کو لیجیے جو تاریخ و روایات کی قدیم سندھی کتابوں میں سے ہے۔ اس میں بھی اس راجہ کا بہت کچھ حال لکھا ہے۔ ایرانی شہنشاہ شاہ نیمروز نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا تو سہاسی دوم اس کا جانشین ہوا۔ راجہ سہاسی دوم نے اُچ کے قلعے کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ اس کے عہد کی ایک دلچسپ خصوصیت چچ سلائج نامی ایک قسمت آزما کے ڈرامائی عروج کی داستان ہے۔ کہتے ہیں کہ راجہ سہاسی دوم کا ایک وزیر تھا، بدھیمان نامی، جو حکومت کا سارا کاروبار چلاتا تھا۔ ایک دن جب کہ وہ دیبل کے بادشاہ کے ہاں سے آئی ہوئی ایک اہم چٹھی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ چچ سلائج نامی ایک برہمن اس کے پاس آیا اور اپنی خدمات کو پیش کیا۔ وزیر نے از راہ امتحان شاہ دیبل کی وہ اہم چٹھی اسے دے دی اور کہا اس کا جواب لکھو۔ چچ نے اس جواب میں غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی وجہ سے بدھیمان نے اسے نوکر رکھ لیا۔ ایک موقع پر جب کہ وزیر پایۂ تخت کے باہر تھا، چچ ایک اہم خدمت سرانجام دے کر راجہ سہاسی کا مقرب بن گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ رانی اس سے محبت کرنے لگی اور راجہ کے مرنے پر چچ ہی تخت کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے رانی سے شادی کر لی اور تخت کے دوسرے دعویداروں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی سلسلے کا ایک مشہور قصہ وہ ہے جس میں چچ، راجہ دہارت کو دھوکے سے قتل کرتا ہے۔ دہارت نے سابق راجہ کا انتقام لینے کے لئے جو اس کا رشتہ دار تھا، اُچ پر حملہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عیار و طرار برہمن نے پورے چالیس برس راج کیا اور طبعی موت مرا۔ اس کے بعد اس کا بھائی چندر سلائج سات برس تک برسر حکومت رہا۔ سندھ کا مشہور بادشاہ داہر، جسے اس ملک کے اولین مسلم فاتح محمد بن قاسم نے شکست دی تھی، اسی چچ کا بیٹا تھا۔

عہد اسلامی

محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۷۱۲ء عیسوی) ایک عظیم الشان کارنامہ تھی لیکن اسے ثبات نصیب نہ ہوا، کیونکہ محمد بن قاسم اس ملک میں ایک ہی سال رہ پایا تھا کہ واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد یزید سکسکی گورنر مقرر ہوا۔ تقرر کے تھوڑے ہی دن بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا اور سندھ کے مقامی سردار پھر اپنے علاقوں پر قابض ہو بیٹھے۔ ۱۰۰۰ء کے قریب جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا تو جے پال پر فتح پانے کے بعد وہ اُچ پر بھی یلغار کرنے کے آیا۔ اُچ پر ان دنوں ابو الفتح نامی ایک قرامطی حکمران تھا۔ سلطان محمود نے

غربی پاکستان کا ایک قدیم علمی و ثقافتی مرکز)

جامع مسجد
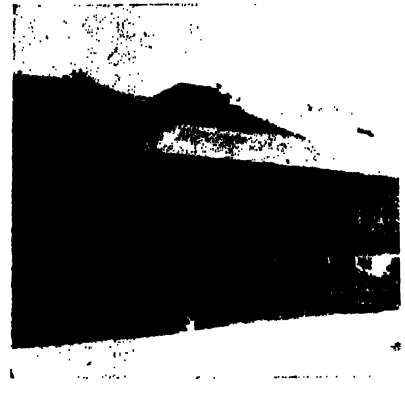
روضہ حضرت سید جلال بخاری رح

روضہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح
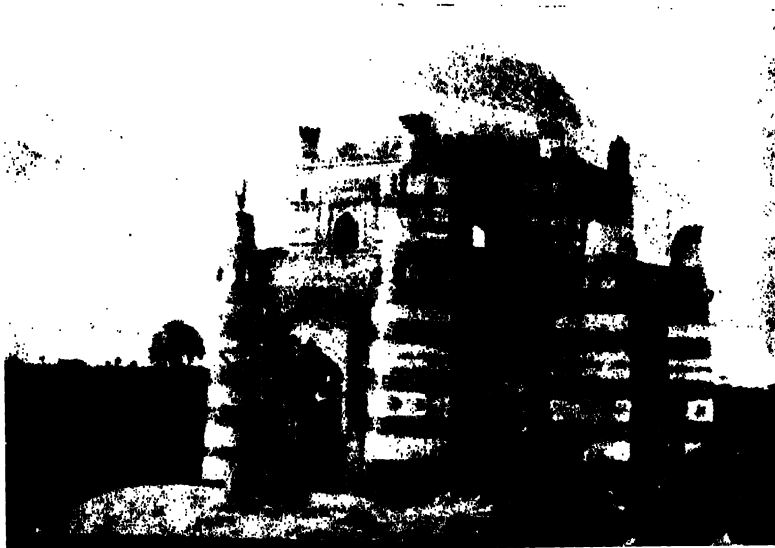
مقبرہ مائی جاوندی

پاکستان میں

ریڈیو پاکستان حیدرآباد (سندھ)

کراچی میں بین الاقوامی دنگل
فضیلت مآب میجر جنرل اسکندر مرزا انعامات تقسیم فرما رہے ہیں

ریڈیو پاکستان حیدرآباد (سندھ) میں نشریات کا آغاز

فضیلت مآب میجر جنرل اسکندر مرزا اور عزت مآب چودھری محمد علی
مشرقی پاکستان کے سیلاب زدہ علاقوں کا معائنہ فرما رہے ہیں

اسے شکست دی، لیکن بعد ازاں اس کو پنجاب کا حاکم بنا دیا، جس میں اُچ بھی شامل تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے عہدِ حکومت میں اُچ غزنویوں کا مطیع فرمان رہا، لیکن جب مسعود کا بیٹا ابوالحسن تخت پر بیٹھا تو علی بن امیر نامی ایک موقع شناس شخص نے پشاور سے اُچ تک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۱۲ء میں سلطان محمد غوری نے صحیح معنوں میں اس ملک کو فتح کرنا شروع کیا۔ اس نے ملتان اور اُچ پر بھی قبضہ کیا اور علی کرمج کو وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا۔ محمد غوری کے عہدِ حکومت میں اُچ کے مشہور دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی جس کے صدر معلم مشہور عالم اور درویش حضرت صفی الدین گزرانی تھے۔ اس دارالعلوم میں کوئی پچیس سو طالب علم رہتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ بزرگ سنہ ۱۲۴۷ء میں بغداد سے وارد ہندوستان ہوئے تھے اور اس ملک میں اسلام کے پہلے جلیل القدر مبلغ تھے۔ ان کا مقبرہ آج بھی موجود ہے اور سارے برِعظیم میں شاید ہی کوئی اور مقبرہ اس قدر قدیم اور اہم ہو۔

سلطان محمد غوری کی وفات کے بعد اس کے نائب قباچہ نے سرِ ہند سے ٹھٹھہ تک سارے علاقے کی حکومت سنبھال لی اور اُچ کو پایۂ تخت قرار دیا۔ "طبقاتِ ناصری" کے مصنف مولوی منہاج السراج لکھتے ہیں:

> "سنہ ۱۲۲۷ء میں جب میں اُچ پہنچا تو وہاں سلطان ناصر الدین قباچہ سریر آرائے سلطنت تھے۔ عوام میں تعلیم عام تھی، شاہی دارالعلوم کے علاوہ اُچ میں اور بھی پائے کی درسگاہیں تھیں۔"

مولوی منہاج السراج خود اس دارالعلوم کے کچھ دنوں تک منتظم رہے اور چند سال قاضی کے عہدے پر بھی کام کیا۔

کھوکھر قبیلے سے جنگ و جدال کا معرکہ پیش آیا تو قباچہ اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ کھوکھروں کے سردار جلال الدین نے اسے نکال کر اُچ کو تاخت و تاراج کیا۔ جب چنگیز خاں کے جرنیل چغتائی خاں نے جلال الدین کو وہاں سے نکالا تو قباچہ پھر پناہ لینے کے لئے اُچ پہنچ گیا، لیکن اُچ کے باشندے اس کے مظالم سے خائف تھے۔ انہوں نے شہر کے دروازے بند کر دیئے اور اسے اندر نہ آنے دیا۔ ادھر جلال الدین اپنی ہزیمت پر برافروختہ تھا، اس نے سارے شہر کو آگ لگا دی۔ اور خود مکران کی طرف بھاگ گیا۔

سلطان ناصر الدین قباچہ پھر اُچ واپس آیا اور شہر کو نئے سرے سے آباد کیا، لیکن اس نو آبادکاری کو بمشکل دو سال گزرے تھے کہ سلطان شمس الدین التمش نے چڑھائی کر دی اور قباچہ کو جان کی سلامتی کے لئے راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔

"تاریخِ فرشتہ" میں اس حملے کی تقریب یہ بیان کی گئی ہے کہ قباچہ کے افسروں اور اہلکاروں نے بدکرداری اور بداخلاقی کو شعار بنا لیا تھا۔ حاکمِ ملتان، قاضی شرف الدین اور ایک مقامی بزرگ، حضرت شیخ بہاء الدین کو اس کا بہت رنج ہوا۔ انہوں نے سلطان التمش کو درخواست بھیجی کہ آ کر قباچہ کے دستِ تعدی سے لوگوں کو نجات دلائیے۔ سوء اتفاق سے ان کے خطوط قباچہ کے ہاتھ لگ گئے۔ اس لئے فوراً ملتان پر چڑھائی کر دی اور وہاں کے گورنر قاضی شرف الدین کو شکست دے کر اس کا سر قلم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ قباچہ نے حضرت شیخ بہاء الدین سے ان خطوط کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے نہ صرف یہ تسلیم کیا کہ انہوں نے یہ خط لکھے تھے بلکہ اسے سخت نہمائش بھی کی کہ خلقِ خدا پر ظلم و ستم سے باز رہے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے۔

مغلوں نے اُچ پر متعدد بار حملے کئے۔ سب سے پہلا حملہ انہوں نے ۱۲۴۵ء میں کیا جب کہ ان کا لشکر قندھار جا رہا تھا۔ انہوں نے اُچ کا محاصرہ کیا لیکن بعد میں یہ سوچ کر اٹھا لیا کہ اس میں خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا، ہمارا اصل مقصد تو فارس پر حملہ ہے۔ اُچ میں سلطان رکن الدین کی حکومت کا زمانہ اسی کے لگ بھگ پڑتا ہے، جب مشہور صوفی اور عالم سید جلال بخاری کی اُچ میں تشریف آوری ہوئی۔ ان کا مقبرہ شہر کے مغربی گوشے میں ایک ٹیکری پر کھنڈرات کے درمیان واقع ہے۔ یہ حصہ شہر انہی کے نام پر اُچ بخاری کہلاتا ہے۔ سید جلال بخاری ۱۱۹۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۱ء میں ۹۴ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کی زندگی فقر اور نفس کشی کی ایک زندہ مثال تھی۔ وہ پندرہ بیس برس کے ہوئے تھے کہ ان سے روحانی کمالات کا ظہور ہونے لگا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے چنگیز خاں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس پر اس وحشی اور تند خو خان نے انہیں آگ میں ڈال دینے کا حکم دیا۔ قدرتِ حق سے ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا اور وہ آگ سے زندہ سلامت برآمد ہوئے۔ چنگیز خاں پر اس کا ایسا اثر

ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا اور جہانگیر خاں کا نام اختیار کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی بیٹی زینب بھی سید صاحب کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔ سید جلال بخاری کے مریدوں اور حلقہ بگوشوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اور وہ آج ہی میں نہیں سارے برعظیم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے غیر معمولی کشف و کرامات کی بیسیوں داستانیں لوگوں میں مشہور ہیں۔ ان کا وصال آج کے قریب ہی "چناب رسول" نامی ایک گاؤں میں ہوا اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ ایک بار سیلاب سے ان کے مزار کو شدید نقصان پہنچا، لہذا ان کا جسد مبارک "سیونک بیلا" میں منتقل کر دیا گیا لیکن وہاں بھی سیلاب سے اسے گزند پہنچنے لگا۔ آخر جسدِ مبارک کو وہاں سے نکال کر راجن قتال کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا۔ ۱۶۲۵ء میں اسے وہاں سے بھی نکال لیا گیا اور موجودہ جگہ پر ان کا مزار بنا۔ ان کے مزار پر جو مقبرہ اس وقت نظر آتا ہے وہ نواب بہاول خاں کے حکم سے ۱۸۳۵ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مغلوں کے حملے

اس برعظیم میں سریر آرائے سلطنت ہونے سے قبل مغلوں نے دو بار اُچ اور ملتان پر حملے کئے۔ پہلی بار تو وہ غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ۱۱۲۷ء میں چڑھائی کر کے آئے اور دوسری بار ۱۲۹۱ء میں جبکہ دہلی میں سلطان جلال الدین خلجی بادشاہ تھا۔ دونوں بار انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُچ اور ملتان دونوں دہلی کی متابعت سے آزاد اور خود مختار ہو گئے تھے۔ علاءالدین تخت پر بیٹھا تو اس نے دوبارہ ان کو فتح کیا۔ مغلوں نے ۱۳۰۴ء اور ۱۳۰۶ء میں پھر دو بڑے حملے کئے۔ ان پر آشوب دنوں میں اس جگہ کئی حاکم آئے اور کئی گئے۔ آخر غازی بیگ گورنر ہوئے جو آگے چل کر غیاث الدین تغلق کے نام سے بادشاہ بنے۔

اُچ کا دارالعلوم غازی بیگ کی گورنری کے عہد میں قائم ہوا اور جب وہ دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے اُچ کی حکومت کی باگ ڈور اپنے بھائی بہرام کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۲۶ء میں مغل سردار "ترماشرین" نے اُچ اور ملتان پر زوروں کا حملہ کیا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اس حملے کے چند سال بعد ۱۳۳۳ء میں اُچ میں وارد ہوا تھا۔

اس موقع پر ہم اس بزرگ روشن ضمیر کا بھی تذکرہ کریں گے جو "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا زمانہ بھی تقریب قریب یہی تھا۔ ان کی ولادت ۱۳۰۷ء میں ہوئی اور وہ سید جلال بخاری کے پوتے تھے۔ انہوں نے علوم دینی دستری کی تحصیل قاضی بہاءالدین اور شاہ رکن عالم ملتانی سے کی اور روحانی فیض حضرت جمال شیخ سے حاصل کیا۔ محمد تغلق کے زمانے میں وہ شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز رہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے سب سے جلیل القدر اور واجب الاحترام عالم دین سمجھے جاتے تھے۔ اور مذہبی امور میں سرکاری مشیر کا درجہ بھی رکھتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سارے اسلامی ممالک کا دورہ کیا تھا اور اسی سیاحی کی وجہ سے "جہاں گشت" کے لقب سے مشہور ہیں۔ "حقیقت الاسرار" میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۳۸۳ء اور ۱۳۸۶ء کے درمیان ۷۷ برس کی عمر میں ہوا۔ ان کا مزار شہر کے شمالی حصے میں ہے، اور ان کے مقبرے پر زائرین کا مجمع رہتا ہے۔

۱۳۶۶ء میں مغلوں نے پھر اُچ پر حملہ کیا لیکن اپنے شعار کے مطابق اُچ، ملتان اور دیپالپور کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد شاہی افواج کی آمد سے قبل ہی فرار ہو گئے۔ ۱۳۹۷ء میں تیمور کا پوتا مرزا پیر محمد اُچ آیا۔ وہاں اسے دہلی پر تیمور کی چڑھائی کا حال معلوم ہوا تو اس نے بھی ملتان کے راستے دہلی کا رخ کیا۔ تیمور کے حملے کے بعد اُچ سیدوں کے زیر نگیں رہا، جن سے اسے لنگاہوں نے چھینا۔ لنگاہوں میں قطب الدین لنگاہ مشہور حکمران گزرا ہے، جس نے ۱۳۲۳ء میں وفات پائی۔ اس کی قبر حضرت بندگی محمد غوث کے قریب ہے۔

حضرت بندگی محمد غوث بھی ایک برگزیدہ بزرگ تھے۔ وہ سید بخاری کے کوئی ڈھائی سو سال بعد ۱۴۸۳ء میں لنگاہوں کے دور اقتدار میں اُچ تشریف لائے۔ وہ عالم اسلام کی عظیم المرتبت شخصیت شیخ عبدالقادر جیلانی کی نویں پشت میں تھے۔ حضرت شیخ کی آل سے جو بزرگ ہندوستان میں آ کر آباد ہوئے، وہ بھی روحانیت اور سلوک کے اعلیٰ مراتب کو پہنچے۔ ان کی کرامتوں کی بے شمار داستانیں مشہور ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا اعجاز تو اس ملک میں نور حق کی اشاعت ہے۔ ان کی روشن کی ہوئی شمع حقیقت آج بھی اسی طرح فروزاں ہے اور لوگ دور و نزدیک سے آ کر اس سے کسب نور کرتے ہیں، روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔

حضرت بندگی کا وصال ۱۵۱۰ء میں نوے برس کی عمر میں ہوا۔ انکے مزار پر جو مقبرہ ہے وہ بہت پرانا ہے، لیکن طرز تعمیر نہایت عمدہ اور دلکش ہے۔ اس مقبرے کے ساتھ ہی ایک خوبصورت مسجد بھی ہے جو ۱۶۲۶ء کی تعمیر ہے۔

اچ کے حکمراں لنگاہوں کے بعد اچ پر سمّوں اور ارغونوں کی بالادستی قائم رہی، حتیٰ کہ ۱۵۲۹ء میں جبکہ دہلی میں ہمایوں برسرِ حکومت تھا، اچ کو سلطنت مغلیہ میں شامل کیا گیا۔ اچ آئے دن کے حملوں اور ترکتازیوں سے تباہ و برباد ہو چکا تھا اور رہی سہی کسر طغیانیوں نے پوری کر دی تھی۔ مغل افسروں نے اس کی تعمیرِ نو کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے قلعے کو مستحکم کیا اور اسکول، عدالت اور کوتوالی قائم کی۔ جب ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگا تو اچ پر کچھ عرصے کے لئے پھر ارغونوں کا تسلط ہو گیا، لیکن ہمایوں کی دوبارہ تختِ نشینی کے بعد پھر یہ دہلی کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا۔ ہمایوں نے ابوالمعالی کو اچ کا حاکم مقرر کیا۔

اکبر کے عہد میں اچ کی عنانِ حکومت یکے بعد دیگرے بہادر خاں، بیرم خاں اور شمس الدین اتگہ کے سپرد کی گئی۔ ۱۵۵۸ء میں اکبر نے محمد صادق خاں ہروی کو شکست دے کر سیوستان پر قبضہ کیا تو اس نے ملتان، اچ اور سکھر کو الگ الگ صوبے بنا دیا اور ہر جگہ ایک علیحدہ صوبیدار مقرر کیا۔

شاہجہاں کے دور میں قلیچ خاں، پھر نواب جان محمد، اور اس کے بعد سید موسیٰ، اچ کے حاکم رہے۔ ان دنوں صوبیدار تو ملتان میں رہتا تھا، البتہ اس کا نائب اچ میں ہوتا تھا۔ اس وقت تک اچ تعلیمی اور ثقافتی مرکز کے طور پر اپنی پہلی اہمیت بہت کچھ کھو چکا تھا۔ اور انتظامی لحاظ سے صوبہ ملتان کا ایک جزو بن کر رہ گیا تھا۔ ۱۷۲۶ء میں عباسی شہزادوں نے بہاولپور ریاست قائم کی۔ اسی وقت سے اچ اس ریاست کا حصہ چلا آ رہا ہے۔

اسی علاقے میں جو دیگر درگاہیں اور مقبرے قابلِ زیارت ہیں ان میں ایک سید صدرالدین معروف بہ راجن قتال کا مقبرہ ہے جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بھائی تھے۔ پھر حضرت جہاں گشت کے استاد، حضرت بہاول حلیم کا مقبرہ ہے۔ دریائے چناب میں جو طغیانی ۱۸۱۷ء میں آئی تھی، اس کی دستبرد سے اب یہ محض کھنڈر رہ گیا ہے۔ ان سے کہیں پرانا مقبرہ شیخ صفی الدینؒ کا ہے، جو بغداد سے ۹۸۰ء میں یہاں آئے اور ۱۰۰۸ء میں فوت ہوئے۔

سید جلال بخاری کے مقبرے کے دروازے کے پاس ان کے ایک مرید سچّڑ کی درگاہ ہے جنہوں نے یہ لقب اپنی بے خوفی اور راست گفتاری کی بنا پر حاصل کیا تھا۔ وہ ڈیرہ غازی خاں کے حکمران خاندان کے ایک فرد تھے، جو آرام و آسائش کی زندگی ترک کر کے درویش ہو گئے تھے۔ وہ زندگی کی گہری صداقتوں اور حقیقتوں کے محرم ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کے ظریف تھے۔ مقامی لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے مزار کا متعدد بار طواف کرتا ہے تو قہقہہ مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک اور دلچسپ اور قابلِ دید مقام ایک خاتون بی بی جاوندی کا چھوٹا سا مقبرہ ہے۔ یہ اچ کے مغربی نواحات میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے، جس کے گرد اگرد کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔ بی بی جاوندی حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کی دختر تھیں اور اپنے زہد و تقویٰ اور روحانی فیوض کی بنا پر اس خاک پاک کے اولیا میں شمار ہوتی ہیں۔

یہ ہے اچ کا شہر جس سے کتنی ہی پرانی یادیں، تاریخی داستانیں اور مذہبی عقیدتیں وابستہ ہیں۔ آج کے لوگوں کو مذہبی یادگاروں اور درگاہوں، صوفیوں اور درویشوں کی باتیں شاید افسانہ معلوم ہوں گی، لیکن یہ سب زندہ حقیقتیں ہیں، اس لحاظ سے کہ یہاں کے سادہ دل دیہاتیوں اور دور و نزدیک کے بے شمار عقیدتمندوں کے لئے ان میں روحانی تسکین اور کیف و جذب کا سامان موجود ہے۔ تاریخ کا طالب علم تو اس مقام سے کسی طرح سرسری طور پر نہیں گزر سکتا، کیونکہ یہ اس برِ عظیم کی قدیم ترین بستیوں میں سے ہے اور صدیوں تک فکر و خیال اور انقلاباتِ زمانہ کے دھاروں کا سنگم رہی ہے۔

(مترجمہ: ابنِ انشا)

غزل

جوشؔ ملیح آبادی

وہ درد کے دن باقی نہ رہے درماں کی وہ راتیں بیت گئیں
دل تھام کے جن میں روتے تھے ہجراں کی وہ راتیں بیت گئیں

نہروں پہ گلے جو ملتی تھیں، شاخوں میں اُلجھ کر ہلتی تھیں
شبنم سے جو دُھل کر کھلتی تھیں بستاں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو حُسنِ رواں سے رخشاں تھیں وہ مصر کی صبحیں شام ہوئیں
جو بوئے قبا سے رقصاں تھیں کنعاں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو خوف سے آہیں بھرتی تھیں آغوش میں آتے ڈرتی تھیں
جو چھُپ کے چراغاں کرتی تھیں افشاں کی وہ راتیں بیت گئیں

ہر آہ میں اک بسطِ غلطاں، ہر ٹیس میں اک لذتِ رقصاں
سو عیش کے دن جن پر قرباں حرماں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو دل پہ مصیبت لاتی تھیں، سینے میں گرجتی گاتی تھیں
آنکھوں سے جو مینہ برساتی تھیں طوفاں کی وہ راتیں بیت گئیں

گھنگھور اندھیرا چھایا ہے ارماں کے جواہر خانے میں
نیلم کی وہ شامیں خاک ہوئیں مرجاں کی وہ راتیں بیت گئیں

خود ایماں جن سے تاباں تھا وہ کفر کا سورج ڈوب گیا
خود عصمت جن پہ نازاں تھی عصیاں کی وہ راتیں بیت گئیں

خطبے تھے مغاں کے معبد میں، سجدے تھے بتوں کے قدموں پر
ایماں کے وہ دن برباد ہوئے عرفاں کی وہ راتیں بیت گئیں

آغوش میں گورے مہوش تھے اور دوش پہ کالی زلفیں تھیں
وہ عہد کے لمحے روٹھ گئے، پیماں کی وہ راتیں بیت گئیں

وحشت کے جزیرے ڈوب گئے، پھولوں کی سواری دور گئی
منجیں وہ گریباں کی نہ رہیں داماں کی وہ راتیں بیت گئیں

دل جوشؔ دھڑکتا رہتا تھا جب زلفِ سیہ کے حلقوں میں
وہ قید کے دن باقی نہ رہے زنداں کی وہ راتیں بیت گئیں

غزل

ناصر کاظمی

حسن کو دل میں چھپا کر دیکھو
دھیان کی شمع جلا کر دیکھو

کیا عجب پھر کوئی نغمہ پھوٹے
دل پہ اک چوٹ تو کھا کر دیکھو

کیا خبر کوئی دفینہ مل جائے
کوئی دیوار گرا کر دیکھو

فاختہ چپ ہے بڑی دیر سے کیوں
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو

نہر کیوں سو گئی چلتے چلتے
کوئی پتھر ہی گرا کر دیکھو

کیوں چمن چھوڑ دیا خوشبو نے
پھول کے پاس تو جا کر دیکھو

دل میں بیتاب ہیں کیا کیا منظر
کبھی اس شہر میں آ کر دیکھو

ان اندھیروں میں کرن ہے کوئی
شب زدو آنکھ اٹھا کر دیکھو

کل یہاں جشنِ بہاراں ہوگا
وہ سماں دھیان میں لا کر دیکھو

غزل

باقی صدیقی

تیرے در تک نہیں جانے پاتے
ہم کہاں اور ٹھکانے پاتے

ہر قدم پر ہے نیا ہنگامہ
ہوش میں ہم نہیں آنے پاتے

تم عناں گیرِ جنوں ہو ورنہ
چور چور آئینہ خانے پاتے

لوگ غربت کا گلہ کرتے ہیں
ہم وطن سے نہیں جانے پاتے

درد ہوتا تو مسلسل ہوتا
دل کو ہم دل تو بنانے پاتے

تیری محفل نہیں غم کی محفل
بار کیا میرے فسانے پاتے

ہم بگولے بھی نہیں تھے ورنہ
گردِ منزل تو اڑانے پاتے

غم اگر ساتھ نہ دیتا باقی
وحشت بھی ہم نہ بسانے پاتے

غزل

شان الحق حقی

اگرچہ ہے تمہیں اپنے ہر اک بیاں سے گریز
کروگے قول سے نظروں کے کس زباں سے گریز

وہیں چھپے نہ ہوں اے دل حقیقتوں کے نشاں
مری نظر نے کیا ہے جہاں جہاں سے گریز

بقدرِ شوق تھی تمہیدِ مدّعا لیکن
کوئی مقام نہ سوجھا کہ ہو کہاں سے گریز

شروعِ راہِ وفا ہے ابھی تو دیکھئے گا
کوئی یہاں سے کرے گا کوئی وہاں سے گریز

بڑی حسیں ہے یہ کیفیتِ قبولِ وفا
کہ دل سے سیکڑوں اقرار اور زباں سے گریز

کسے فسانۂ ہستی کی ابتدا معلوم
جُز ایں قدر کہ ہوا دل کی داستاں سے گریز

لکھی تھیں دل کے مقدر میں الجھنیں ورنہ
مری وفا نے تو چاہا تھا ہر گماں سے گریز

غزل

حبیب جالب

سونی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی ویراں ہے
ایک خموشی، ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے

ایک زمانہ وہ کہ تجھے میں یاد تھا اور اب یاد نہیں
تیرا ہر انداز مری جاں ایک انوکھا احساں ہے

کتنی دُور چلا آیا ہوں چھوڑ کے تیری بستی کو
لیکن دل تیری گلیوں میں آج تلک سرگرداں ہے

پھر سورج کے ساتھ ترے ملنے کا امکاں ڈوب گیا
پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے

پھر اُن پیار بھری ندیوں کی یاد میں آنکھیں پُرنم ہیں
پھر اُس بچھڑے دیس کے غم میں شہرِ دل و جاں ویراں ہے

جالبؔ اب اُس جانِ غزل کے پیار سے لاکھ انکار کریں
آنکھوں کی پُرسوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے

غزل

صہبا اختر

سایۂ زلف میں اک رات بسر ہونے تک
کتنی صبحوں کو تراشا ہے سحر ہونے تک

دل کی دنیا ہے جہنم کی طرح شعلہ فروز
یہ جہنم ہے مگر تیرا گزر ہونے تک

تیرگی بننے لگی شوخ اجالوں کے کفن
دیکھیں کیا گذرے ستاروں پہ سحر ہونے تک

کتنے طوفانوں سے ظلمت کے گذرنا ہے ہنوز
چاند تاروں کو تری راہگذر ہونے تک

دیدۂ تر ابھی تیرا ہے شبستانِ وجود
کچھ دیئے اور جلا خونِ جگر ہونے تک

زندگی ایک چراغاں ہے بجائے خود بھی
سب اندھیرے ہیں تجلی نظر ہونے تک

اک قیامت ہی سہی دل سے گذرنا تیرا
ہم بھی زندہ ہیں قیامت کا گذر ہونے تک

میں نے اک زندگی تازہ خدا سے مانگی
اور وہ بھی کسی ظالم پہ اثر ہونے تک

راکھ ہو جائے گی یہ شمعِ تمنا صہبا
ان کو اس دل کے اندھیروں کی خبر ہونے تک

غزل

ادیب سہارنپوری

دل اب موہوم امیدوں سے بہلائے نہیں جاتے
جو دھوکے عمر بھر کھائے ہیں وہ کھائے نہیں جاتے

تری مخمور آنکھوں میں، ترے گل رنگ ہونٹوں پر
ہزاروں گیت ایسے بھی ہیں جو گائے نہیں جاتے

بغیر ان کے بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے ہم دو عالم میں کہیں پائے نہیں جاتے

خوشی کی چھاؤں میں بیٹھے، غموں کی دھوپ بھی جھیلی
خیالوں سے تری دیوار کے سائے نہیں جاتے

بہاراں اور گلوں کا رنگِ وحشت ایک جیسا ہے
نکل جاتے ہیں یوں دامن کہ سلوائے نہیں جاتے

سکوں کی جستجو، آسودگی کی آرزوؤں نے
قدم ایسے نکالے ہیں کہ ٹھہرائے نہیں جاتے

ہماری تشنگی کی شرم رکھ لے ساقیِ محفل
بھری محفل میں ہم سے ہاتھ پھیلائے نہیں جاتے

چلو خود ہی ادیب اس بزم میں تم بھی کہ پروانے
حضورِ شمع خود جاتے ہیں بلوائے نہیں جاتے

"اقوام متحدہ"

مشرقی بنگال میں تپ دق کی روک تھام

آغا محمد اشرف

پاکستان میں ہر سال تقریباً ڈیڑھ لاکھ قیمتی جانیں تپ دق اور سل کے نامراد مرض کی نذر ہو جاتی ہیں۔ شہروں کی گنجان آبادیاں، تاریک اور متعفن گلی کوچے اور ایسے چھوٹے چھوٹے اندھیرے گھر کہ جہاں صاف ہوا کا مشکل سے گذر ہوتا ہے، اس مرض کی بہترین آماجگاہ ہیں۔ اس کے علاوہ ناکافی غذا اور عوام کی غربت اس موذی بیماری کو اپنے شکار پھنسانے میں اور ہاتھ بٹاتی ہے۔ اب تک اس مرض کی روک تھام کے لئے کسی قسم کی مسلسل کوشش نہیں کی گئی ہے، کیونکہ مریضوں کے علاج اور مرض کے تدارک کے لئے ہسپتالوں، ڈاکٹروں، نرسوں اور اس نئے سامان کی ضرورت ہے جو بیسویں صدی میں تپ دق کے خلاف جنگ کے لئے سائنس کے تجربوں نے ہمیں دیا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں نئے سامان کا تو ذکر ہی کیا ہے، شفاخانوں اور ہسپتالوں کی اس قدر کمی ہے کہ اس بڑھتے ہوئے روگ کی ترقی کو روکنے کے لئے پہلا مورچہ بھی قائم نہیں ہو سکا تھا۔ ڈاکٹروں کے متعلق اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ ہر ۴۳ ہزار باشندوں کے لئے صرف ایک ڈاکٹر مہیا ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر مشرقی بنگال کو ہی لے لیجئے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس صوبے کی آبادی تقریباً ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے۔ اس علاقے میں فی مربع میل ۷۰۰ سے لے کر ایک ہزار تک انسان آباد ہیں۔ اور آبادی کی یہ اوسط ڈھاکے جیسے شہر میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے مشرقی بنگال کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ گنجان آباد علاقوں میں ہوتا ہے۔

آبادی کی کثرت کے ساتھ اگر حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ تپ دق اور سل کے مرض کی شکل میں بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ آئے دن ان شہریوں پر ملیریا، ہیضے اور اسی قسم کی دوسری بیماریاں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ بدقسمتی سے صحت کے متعلق ابھی تک ہمارے ہاں مکمل اعداد و شمار موجود نہیں لیکن جتنی معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں مشرقی بنگال کے تین دیہاتی علاقوں میں بسنے والے باشندوں میں سے ۵۰ فیصدی سے زیادہ تپ دق کی زد میں آ چکے تھے۔ اس سے قبل ۱۹۴۶ء میں ایک اور سرکاری رپورٹ کے مطابق ہر ایک لاکھ باشندوں میں سے ۱۷۹ باشندوں کی موت کا موجب تپ دق کا مرض تھا۔

یہ اعداد و شمار اپنی جگہ پر تباہی اور بربادی کی منہ بولتی داستان ہیں کہ جس پر کسی قسم کا حاشیہ چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا علاج صرف ایک ہی طرح ممکن تھا اور وہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں کسی بیرونی ادارے کی امداد سے تپ دق کی روک تھام کا منصوبہ مرتب کیا جائے۔ اور اس طرح جو چند تجربے حاصل ہوں، ان کی روشنی میں صوبے میں جگہ جگہ ہسپتال، طبی امداد کے مرکز اور شفاخانے کھولے جائیں۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں حکومتِ پاکستان کی درخواست پر عالمی ادارۂ صحت کے چند ماہر ڈھاکے پہونچے۔ کام شروع کرنے سے پہلے انہوں نے ڈھاکہ کے حالات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اس وقت ڈھاکہ شہر کی آبادی ۵ لاکھ کے لگ بھگ تھی اور اتنے بڑے شہر میں تپ دق کے مریضوں کے لئے کوئی شفاخانہ موجود نہیں تھا۔ ایک ہسپتال ضرور تھا مگر وہاں تپ دق کے مریضوں کے لئے صرف ۶۹ بستروں کا اہتمام تھا جو مرض کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یقیناً ناکافی تھا۔

عالمی ادارۂ صحت کے ماہروں نے ڈھاکہ پہنچتے ہی ایک کنٹرول سنٹر قائم کیا۔ جو اس علاقے میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ تھا۔ اس سنٹر میں تپ دق کی روک تھام کے لئے مستند طریقوں کے مطابق عمل کیا گیا اور

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

جاپانی ادب (۲)

کیویا ڈوئی

"اکاواهیبر دیوئی" کا ناول "شیطان کی چھوڑی ہوئی دولت" اسکا محض خاکہ یہ ہے کہ اس کہانی کا ہیرو اخبار نویس ہے۔ اخبار کیلئے رپورٹ لکھنے کے لئے ہیروشیما جاتا ہے۔ جانے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اب ہیروشیما اچھی طرح بس چکا ہے اور بم کا اثر دیکھنا مشکل ہوگا۔ مگر جب وہ ہیروشیما پہنچا، تو امید کے خلاف بم کے بہت سے اثرات اس کی نظر سے گزرے۔ ہیروشیما میں چچا کے گھر میں ٹھہرا تھا۔ چچا یکایک بیمار پڑ گیا مگر اس بیماری کا سبب بالکل معلوم نہ ہو سکا۔ شہر میں ایک اسپتال ہے جہاں ایٹم بم کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس اسپتال میں ایک جاپانی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی اور شکایت سنی کہ اس اسپتال میں ایٹم بم کے بیماروں میں پیدا شدہ اثرات کا مطالعہ تو کرتے ہیں لیکن ان بیماروں کا علاج بالکل نہیں کرتے۔ ایک دن چچی کے ساتھ شہر میں سیر کر رہا تھا تو یکایک چچی کے چہرہ پر ورم آگیا اور وہ سخت بیمار پڑ گئی۔ اس طرح باہر سے کچھ آثار نظر نہیں آتے لیکن ایٹم بم کا اثر بدن میں ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک دن یکایک اسکا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ آخر ہیرو واپس جا رہا تھا کہ خبر آئی کہ اس کا لڑکا بھی ایٹم کے اثر سے بیمار پڑ گیا ہے۔

ہر دلعزیز مصنفوں میں گیین جی کے تا خاصکر دفتر کے کلرکوں کی زندگی پر غور کرنے کے باعث مشہور رہے۔ ان کے ایک ناول "امن و امان کا زمانہ" میں ہیرو ایک کارخانہ میں کلرک تھا۔ لڑائی کے وقت اس کو فوج میں بھرتی ہو کر جانا پڑا۔ اتنے میں کارخانہ کی حالت بہت خراب ہو گئی اور صدر نے بہت سے حصے بیچ ڈالے۔ ایک دوسرے کارخانہ کے ڈائرکٹر نے یہ سب حصے خرید لئے اور وہ خود آکر کارخانہ کو سنبھالنے لگا۔ اس کے کارخانہ سے کلرک بھی آگئے۔ پرانا صدر معمولی ڈائرکٹر بنا دیا گیا اور دفتر میں ایک شعبہ کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ آہستہ آہستہ ایسا ہونے لگا کہ نئے صدر کے کارخانہ سے آئے ہوئے کلرکوں کے مقابلہ میں پرانے کلرکوں کی حالت بگڑتی گئی۔ اتنے میں ہیرو لڑائی سے واپس آتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ کارخانہ کا حال بالکل بدلا ہوا ہے۔ پرانا صدر تنزل پا کر اب معمولی افسر رہ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ حصے جو پرانے صدر نے بیچ ڈالے تھے، پھر خرید لے اور اسی طریقہ سے پرانے صدر کو دوبارہ صدر بنا دے۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر کبھی کبھی ناامید ہو جاتا ہے۔ آخر ایک دوست کی مدد سے چور بازار میں کافی روپیہ کماتا ہے اور اس کارخانہ کے حصص خرید کر پرانے کلرکوں کی حالت سدھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بے شک اس ناول میں محبت کا قصہ بھی شامل ہے۔ نئے صدر کا لڑکا اور پرانے صدر کی لڑکی ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور آپس میں محبت کرتے تھے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ دونوں کے باپ شادی کی اجازت نہیں دیتے تو گھر سے علیحدہ ہو کر رہنے کو تیار ہوتے ہیں اور ہیرو کی مدد سے شادی کرتے ہیں۔ دونوں کی مائیں اپنے اپنے شوہر سے اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادی کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن ناکامیاب رہتی ہیں۔ آخر جب یہ خبر آئی کہ نئی بیوی حاملہ ہو گئی تو دونوں کی ماں اپنے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر جوان میاں بیوی سے ملنے جاتی ہیں۔ کارخانہ میں کلرک لڑکی ہے جو ہیرو سے محبت کرتی ہے۔ اس کی مدد سے کارخانہ کی خبریں ہیرو کو پہنچتی رہتی ہیں۔ لیکن ہیرو کے روپیہ کمانے اور کارخانہ کے حصے خریدنے کے خیال میں لگے رہنے سے شادی کا موقع نہیں ملتا۔ اتنے میں ہیرو کا دوست بھی اس لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ہیرو کے کارخانہ کے حصے خریدنے میں بہت بڑی مدد دینے والا ایک بہت امیر ہے جس کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ اتفاق سے یہ لڑکی اور کلرک لڑکی سہیلیاں تھیں۔ اس امیر کا لڑکا کلرک لڑکی سے اور لڑکی ہیرو سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

آخر کار کلرک لڑکی کی شادی ہیرو کے دوست سے اور ہیرو کی شادی اس امیر کی لڑکی سے ہوتی ہے۔

تاریخی ناول نویسی میں یوشی کاوا اے جی اور موراکامی گین زو بہت مشہور ہیں۔ یوشی کاوا کا عام پسند ناول "مے کے مونوگاتاری" لوگوں میں بہت پڑھا جا رہا ہے۔

شاعری

مے جی کے ابتدائی دور میں شاعری میں بڑی تبدیلی ہو گئی تھی، اس وقت تک جاپان میں صرف واکا اور ہائکو رائج تھیں جو بہت ہی چھوٹی نظمیں ہوتی ہیں۔ واکا میں صرف ۳۱ بول ہوتے ہیں اور ہائکو میں ۱۷۔

واکا:

"آکی نوکامی
یوداروواموشی نو
کوئی نومیکا
کیکو وارے ڈوٹمو
ٹینومی یاوا آرو"

ترجمہ:۔ خزاں آگئی، ہوتی جاتی ہے کمزور کیڑوں کے گانے کی آواز
مچلتا ہے مجھ سننے والے کا دل بھی

ہائیکو میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں جن میں سے پہلے مصرعے میں پانچ بول ہوتے ہیں، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پانچ مثلاً

"می نی شی مویا
بوسئی نوکوشی او
نایا نی فومو"

ترجمہ: میں تھر تھر کانپ اٹھا
خوابگہ میں پاؤں جا پڑا
مرحومہ بیوی کی کنگھی پر!

دَورِ مے جی میں جب یورپ کا تمدن آیا اور یورپ کے ادب سے لوگ واقف ہوئے تو انہیں خیال آیا کہ جاپان کی پرانی نظموں میں بہت چھوٹی ہونے کی وجہ سے، پورا خیال ظاہر نہیں کر سکتے۔ مے جی کے پندرھویں سال یعنی ۱۸۸۲ء میں کچھ علماء نے یورپ کی نظموں کا ترجمہ شائع کیا جس کا نام تھا "نئی نظمیں"۔ اس کے بعد موری اوگائی اور اُوئے دا بِن نے بھی یورپی نظموں کا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں سے لوگوں پر بہت اثر پڑا۔ خود جاپانی نظموں کا پہلا اچھا مجموعہ شیمازاکی توسون کا ہے جو "واکانا شو" کے نام سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ ان کی نظم کا ایک نمونہ یہ ہے:۔

دُور اک جزیرہ سے ـــــ نام بھی معلوم نہیں
بہتا ہوا آ گیا ناریل کا ایک پھل

اپنے وطن سے جدا ہو کے سفر میں تجھے
کتنے مہینے لگے لہروں میں بہتے ہوئے؟

اونچا اور سایہ دار ہوگا ٹھکانا ترا
ڈالیاں دے رہی ہوں گی پیام امن کا

میں بھی تیری طرح لہروں کو ساحل کے پاس
تکیہ بنا کر ہوں سونے والا مسافر اداس

ناریل کے پھل کو اس نے چھاتی سے چمٹا لیا
دیس سے دُوری کا پھر زخم ہرا ہو گیا
دیکھتا ہوں سورج کو دُور اُفق پہ ڈوبتے
آتی ہے وطن کی یاد گرتے ہیں آنسو مرے
یہ مہیب لہریں بے قرار کرتی ہیں کیا کیا مجھے
لوٹ کے کب جا سکوں اپنے وطن، دیکھیے

اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام مصرعے پانچ اور سات بولوں سے بنے ہیں، جیسے

نا مو شیرا مو تو کی شیا یوری
ناگوری یوروباشی نومی ہتو تسو

یہ کسی حد تک واکا کی طرح ہے جس کے مصرعوں میں ۵، ۷، ۵، ۷، ۷ بول ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں جب لوگ یورپی نظموں کی نقل کرتے تھے تو قافیہ بندی کی کوشش کی لیکن جاپانی زبان میں ہر بول کے آخر میں

حرف علت ہونے کی وجہ سے دیگر زبانوں کی طرح قافیہ نہیں جوڑ سکتے۔
اس لئے یکے بعد دیگرے پانچ اور سات بولوں سے مصرعے بنانے لگے۔
اس کے بعد ناولوں کے ساتھ ساتھ نظم کی نشوونما ہوتی گئی۔ فطرت نگاری
کے زمانے یعنی تقریباً، ۱۹۰۸ء سے روزمرہ کی بول چال کی زبان میں
آزاد نظم بہت لکھی جانے لگی۔ آجکل کی نظم کی مثال یہ ہے:۔

رس بھری کا میدان

پگڈنڈی کے آس پاس جنگل میں
ہیں لگی رس بھریاں بہت ساری
توڑیئے تو گر جاتی ہیں ان سہانی
لال لال گولیوں کی دلفزا طراوت کا
میرے ساتھ کیا نہ لطف اٹھاؤ گے کو کتنی کونل کی پرسکون وادی میں؟

●

آج ہر پہاڑ سے اٹھ رہے ہیں دل بادل
جولائی کی ہریالی بڑھ رہی ہے ہر طرف دن بہ دن۔
پیلے پیلے پھولوں کے بن کے بہت ہی قریب
آتی ہیں مجھ کو نظر ابلیس کی چوٹیاں۔۔۔

●

پکی ہوئی رس بھری بنتی ہے خود ہی شراب، کرتی ہے چڑیوں کو مست
بخت نے کی یاوری، ساتھ رہی زندگی
اب ہے بوڑھا پا مرا جیسے پرانی شراب۔ تند و تیز۔

واکا جاپان میں سب سے پرانی وضع کی نظم ہے۔ جاپان میں سب
سے پرانی واکاؤں کا مجموعہ مان یوشو ہے جو ۷۵۰ء کے بعد لکھا
گیا۔ اس زمانے کی واکا بہت سیدھی سادی تھی۔ ۹۰۵ء میں بادشاہ
کے حکم سے واکاؤں کا ایک اور مجموعہ تیار کیا گیا جس کو کوکین شو کہتے ہیں۔
اس کوکین شو کی واکا میں طرز ادا کی بہت نشوونما ہوئی۔ اس کے بعد ۱۲۰۵ء
میں ایک اور مجموعہ بادشاہ کے حکم سے بنا جس کو شین کوکین شو کہتے ہیں
اس مجموعہ میں واکا کی طرز ادا کوکین شو کی طرح ہے۔ لیکن کلام میں بہت
اصلاح ہو گئی ہے۔ یہ تین کتابیں واکا کے لئے سب سے اچھی کتابیں
مانی جاتی ہیں اور بعد کے ہر شاعر ان تینوں میں سے کسی ایک کی نقل کرتے تھے
ہائی کو کی نشوونما دو ادوار میں ہوئی تھی۔ ہائیکو میں سب سے
بڑا شاعر ماتسواو باشو (۱۶۴۴ — ۱۶۹۴ء) ہے۔ ان کے کلام کا ہر زمانہ میں
مطالعہ کیا جاتا رہا ہے۔

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا ہے، جب عہد میجی شروع ہوا تو
لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ واکا اور ہائی کو آجکل کے خیالات کے اظہار کے
لئے بہت مختصر ہیں اور اب جدید طرز کی شاعری کو رواج دینا چاہیئے۔ لیکن
واکا اور ہائی کو جاپانی کی رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہیں۔ انہیں اتنی
آسانی سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔

دور میجی میں واکا اور ہائی کو کو پھر سے ترقی دینے والوں میں
ماساؤکا شیکی (۱۸۶۷ — ۱۹۰۲ء) سب سے بڑے آدمی تھے۔
انہوں نے واکا میں مان یوشیو اور ہائی کو میں باشو کا خاص مطالعہ کیا
تھا۔ ان کا قول ہے کہ شعر میں اسکیچ سب سے ضروری ہے یعنی تصویر بنانے
کی طرح نظم میں بھی خیال کے خدوخال ظاہر ہونے چاہئیں۔ ان کے بعد
بہت سے شاعر ہوئے اور اسکیچ کے نقطہ میں نئے نئے مطالب پیدا
کرتے رہے۔

واکا اور ہائی کو لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ لڑائی کے وقت
سپاہیوں نے اچھی اچھی واکا اور ہائی کو نظمیں لکھی ہیں، جیسے

چینی لوگ
کھیتوں میں بوتے ہیں دھان
آتی ہے وطن کی یاد
میں بھی ہوں اپنے وطن کا کسان

لڑائی کے بعد پھر کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ واکا اور ہائی کو نظم کہنے
کے لئے بہت چھوٹی ہے لیکن آجکل لوگوں کا دھیان قدیم رسموں کے احیاء
کی طرف ہونے کی وجہ سے واکا اور ہائی کو زیادہ لپ کی جا رہی ہے۔ معمولی
لوگوں کے لکھے ہوئے ایک دو نمونے دیکھ لیجئے۔

کیسی خوبصورت ہے
یہ زمین کی پالی ہوئی شے،
ہاتھ میں لے لیا
لال لال دانوں کو
خزاں کے مچھر
بھنبھناتے ہیں سینے کی مشین کے گرد

اس کی آخری قسط ادا کر دی گئی۔

ماہِ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء

فکاھیہ:

حکیم جی

ضمیر جعفری

یہ ان مشہور حکیم بوعلی سینا کا تذکرہ نہیں جو علم طب کے امام مانے گئے ہیں جن حکیم سینا کا ذکر میں کر رہا ہوں اگرچہ ویسے خود وہ بھی اپنے آپ کو وقت کا بوعلی سینا ہی سمجھتے تھے مگر عملاً ہمارے شہر کی ایک ایسی تنگ و تار پتلی سی گلی میں مطب کرتے تھے جہاں طبیب و مریض تو بڑی چیزیں ہیں بہ نفسہ علم طب کا گزر بھی مشکل معلوم ہوتا تھا لیکن انسان وہ مخلوق ہے کہ جب کچھ کرنے پر آتا ہے تو ایک شاعر کے بقول سمندر چیرتا ہے کوہ سے دریا بہاتا ہے۔ اور جب ایک دوسرے شاعر کے بقول۔ کچھ بھی کرنے کو نہیں جی چاہتا۔ تو اس گلی میں مطب تک کر بیٹھتا ہے:

جینا اسی گلی میں مرنا اسی گلی میں!

طبیب کی حیثیت سے حکیم سینا کی شہرتِ صرف اسی قدر تھی کہ وہ تقریباً اسی نوے برس تک زندہ رہے۔ شہرت سے زیادہ لوگوں کو ان کی سخت جانی پر حیرت تھی کہ جس تنگ دستی، تاریکی، حبس و وضع داری کے ساتھ انہوں نے زندگی بسر کی ہے وہ اتنی مدت تک زندہ ہی کیونکر رہ سکے تھے۔ محلے کی طرف سے کمیٹی کے منسوخ ممبر بابو مولا داد سیاہ پوش نے اکثر کہا کہ "اگر حکیم سینا اسی گلی کے نکڑ پر خوانچے میں مونگ پھلی لے کر بیٹھ جاتے تو زیادہ آسودہ ہوتے مگر حکیم صاحب تھے کہ جہاں ایک مرتبہ بیٹھ گئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پچھلی صدی کے چوتھے یا تیسرے ربع میں ان کے والد مرحوم جو عطاری کا دھندا کرتے تھے جہاں ان کو بٹھا گئے تھے وہ پھر وہاں سے اٹھے نہیں۔ آخر آخر میں تو خیر کئی سال سے بذاتِ خود ان کا جینا ہی صحیح معنوں میں بے معنی ہو چکا تھا مگر پچھلے دنوں میں بھی اہل الرائے اصحاب کی رائے یہ تھی کہ حکیم سینا اور امام مسجد مولوی لطف اللہ خاں علی الترتیب حکمت و امامت کے علاوہ کوئی دوسرا دھندا کر ہی نہیں سکتے۔ مولوی لطف اللہ خاں تو نسبتاً پھر بھی آسودہ حال تھے مگر حکیم صاحب کا حال ساری عمر یہ رہا کہ محلے کی بوڑھی خوش عقیدہ عورتوں کو جب کبھی اللہ کی رزاقی و قدرت پر گفتگو مقصود ہوتی تو مثال کے طور پر وہ پتھر کے سینے میں جینے والے کیڑے اور اندھی گلی میں مطب کرنے والے حکیم سینا کا تذکرہ عموماً ایک ہی سانس میں کیا کرتیں۔

حکیم سینا میری طفلی ہی کے زمانے میں جس کو آج کوئی پچیس تیس برس گزر چلے ہیں، اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں کوئی آدمی اپنی افادیت کھو دینے کے بعد محض ایک رائے، ہیر چا، مشغلہ یا قہقہہ رہ جاتا ہے۔ ہمارا شہر کچھ اس قسم کا ہے جہاں ہر شخص ہر شخص کو جانتا ہے بلکہ لوگ ایک دوسرے کے شجرۂ نسب تک سے واقف تھے۔ ہمارے شہر کا ایک معروف معزز شخص جو وزیر تک رہ چکا ہے اپنے شہر میں اب تک میاں حشمت علی ہاشمی ہی کہلاتا ہے۔ یہ دراصل ایک بڑا قصبہ ہے جس کو زرعی ملک کی سیر چشمی نے شہر کا نام دے رکھا ہے۔ چنانچہ حکیم سینا کو شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ بلکہ بڑوں کو چونکہ مدت سے ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی اس لئے شہر کے بچے ان کو کچھ زیادہ ہی جانتے تھے۔ مجھے جس وقت ابھی یہ تمیز بھی نہ تھی کہ طبیب کیا ہوتا ہے اور مطب کسے کہتے ہیں یہ معلوم تھا کہ لہراتی ہوئی سفید ڈاڑھی والا وہ مرد بزرگ جو ہر روز شام کو بلا ناغہ ہاتھ میں موٹا سا عصا لے کر ایک مقررہ راستے پر سیر کو نکلتا ہے، حکیم سینا ہے۔ ذرا بڑا ہوا تو ان کے متعلق اور بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ مثلاً یہ کہ ان کا نام تو عبدالوہاب یا عبدالصبور تھا مگر اپنے آپ کو خاک پائے بوعلی سینا کہتے تھے جو کثرت استعمال سے گھس کر صرف سینا رہ گیا تھا۔ کسی طبیب یا طبی درسگاہ سے فن کی تحصیل قطعاً نہیں کی تھی لیکن خود کو فن کا مجتہد سمجھتے تھے۔ خود بہت چلتے تھے مگر مطب بالکل نہیں چلتا تھا۔ معمولی عوارض کا علاج

یہ نہیں کرتے اور بڑے بڑے امراض کے مریض ان سے علاج نہیں کرواتے۔ عمر بھر شادی نہیں کی۔ نہایت عسرت میں بسر ہوتی ہے۔ مگر متنبی رکھنے کا شوق اتنا ہے کہ کوئی ڈیڑھ درجن تخلص بدل چکے ہیں۔ آگ پر پکی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے چنانچہ ۱۹۲۵ء تک وہ اپنے اس معمول پر پچیس برس کی پابندی کا ریکارڈ قائم کر چکے تھے۔ ترکی کی کلاہ پر نیلے رنگ کی جو پگڑی باندھ کر نکلتے ہیں وہ گزشتہ بیس برس سے بندھی ہوئی ہے۔ مطب میں مریض ملنے کو آ جائے تو اس کو تضیع اوقات گردانتے ہیں۔ طبیعت میں تلخی ہے۔ مزاج چڑچڑا ہے عمر بڑی محنت سے کٹی۔ الغرض ایک سے ایک عجیب تر سینکڑوں باتیں ان سے منسوب اور زبان زد عام تھیں۔

حکیم سینا سے میری باضابطہ ملاقات اس وقت ہوئی جب میں زندگی میں داخل ہونے کے لئے اپنے شہر سے باہر جا رہا تھا۔ حکیم صاحب اس وقت عمر کے اس مقام پر کھڑے تھے جس کے بعد آدمی اچانک کسی دن مر تو جاتا ہے مگر اس سے زیادہ بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ مطب گھر پر ہی تھا بلکہ جیسا کہ بعد میں دیکھا گھر مطب میں تھا چھوٹی اینٹوں کا چھوٹا سا پرانا مکان تھا جس کی بوسیدہ بیرونی دیواروں کے کئی مختلف شگافوں میں سے دس پندرہ کائی اور سوکھے کے لاڈلے پودے اور بیری اور شہتوت کے معزز درخت بیک وقت پروان چڑھتے ہوئے ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ مکان اور درختوں کا رشتہ اتنا قدیم و محکم تھا کہ اب مکان ان ہی کے سہارے کھڑا تھا۔ غالب نے کسی ایسے ہی مکان کی نسبت کہا ہوگا۔

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مطب والی کوٹھڑی گلی میں کھلتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بند ہی نہ ہو سکتی تھی۔ اندر پہنچا تو عام شہرت کے مطابق مطب سائیں سائیں کر رہا تھا۔ حکیم سینا متروک وضع کے ایک پرانے صوفے کی لمبی نشست پر دراز تھے۔ سامنے بے دلی سے چھیلا ہوا دیار کا ایک گرانڈیل میز پڑا تھا جس پر تنگ اور چوڑے دہانوں کی گنی چنی سات بوتلیں رکھی تھیں جن میں سے بالخصوص مٹی رنگ کی ایک بوتل میں سفید سفید گولیاں مطب کے نمناک دھندلکے میں بھی چمک رہی تھیں۔ میز سے لگی ہوئی بے بازو کی دو چوکیاں تھیں اور دیواروں کے تین چار کشادہ طاقوں میں بے شمار چھوٹی بڑی بوتلیں گرد و غبار میں اس اطمینان کے ساتھ اٹی پڑی تھیں کہ اب ان کو چھیڑنے سے نہ معلوم کتنی صدیوں کی دل آزاری کا استعمال ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ پھٹے پرانے کپڑے، مختلف طول و عرض کے کھرل اور انواع و اقسام کے ہاون دستے بے ترتیبی سے پڑے تھے

میری آہٹ سن کر حکیم صاحب اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ پہلے مجھے کوئی مریض ہی سمجھے۔ نبض کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے:۔

"کیا عارضہ ہے؟" میں نے عرض کیا محض اشتیاق ملاقات کھینچ لایا ہے۔ اس پر اپنے خشونت آمیز روکھے پن کو چہرے کی شکنوں سے ظاہر کر کے پہلو سمیٹتے ہوئے بولے:۔

"آپ غالباً اس شہر میں نو وارد ہیں۔ میں نے اس قسم کی ملاقاتوں کو کبھی نہیں سراہا۔ خیر اب آپ آ ہی گئے ہیں تو بیٹھئے لیکن پہلے ذرا میز پر سے میری عینک اٹھا دیجئے۔ مہربانی۔ مگر نہیں۔ رہنے دیجئے۔" اور پھر خود ہی عینک اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے زندگی بھر اپنا ہر کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہ عادت کچھ ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ مثلاً اب آپ عینک اٹھا کر دیتے تو بہت ممکن تھا مجھے اس میں سے کچھ سجھائی ہی نہ دیتا۔"

"اچھا!" میں کچھ تعجب سے بولا

"نہیں۔ یہ نئی پود اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تم لوگ تو معاف کرنا یہ چاہتے ہو کہ تمہاری جگہ حوائج فطریہ بھی کوئی دوسرا ہی بھگت آئے۔" پھر عینک کو ناک کی گھوڑی پر سوار کرتے ہوئے۔ "لیجئے اب بات کیجئے۔ کیا کہوں میری کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ عینک کے بغیر میں گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں تو آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کون ہو عزیز من؟"

اس تمہید کے بعد اس روز کوئی تین گھنٹے ہماری سیر حاصل ملاقات رہی۔ کہاں تو ان کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور کہاں یہ کیفیت جو میں نے دیکھی کہ بیچ میں تین چار مرتبہ اٹھنا چاہا تو زبردستی بٹھا بٹھا لیا۔

ان سے اپنی پوری گفتگو قلمبند کرنے کے لئے تو ظاہر ہے کم از کم تین ہی گھنٹے چاہئیں بہر حال خلاصہ کلام یہ کہ حکیم صاحب اپنے آپ کو واقعی دیانتداری کے ساتھ وقت کا بو علی سینا سمجھتے تھے۔ بو علی سینا تو خیر ان کے پیکر میں دوبارہ پیدا ہو ہی گئے تھے لیکن ان میں بقراط۔ سقراط۔ ابو نصر اور نہ جانے کن کن دوسرے حکمائے اجل کی خوبیاں بھی مجتمع تھیں اس لئے ان کے نزدیک ان کے پایہ کا طبیب آئندہ پیدا ہی نہیں

ہو سکتا تھا۔ دنیا سے وہ شاکی ضرور تھے مگر کچھ اس طرح جیسے کوئی باپ نالائق اولاد کی شکایت کرتا ہو۔ انسانوں کو وہ چمگادڑ سمجھتے تھے جو چشمۂ آفتاب کی روشنی سے محروم ہے۔ فن میں اپنی عظمت کا شعور و غرور ان میں اتنا قوی تھا کہ اس پہ جان کی بازی لگا بیٹھتے اور حقائق سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ وہ کہتے تھے کہ بشری کمزوری کے بعض لمحوں میں جب کبھی ان کے ذہن میں طب چھوڑ کر کوئی دوسرا دھندا کرنے کا خیال آیا تو اسی رات حکیم جالینوس۔ بقراط۔ خود حضرت بوعلی سینا اور علم طب کے بعض دوسرے اعالی واکابر خواب میں آکر کبھی لعنت ملامت کرتے، کبھی ہاتھ جوڑ کر منت سماجت سے کہ دیکھو اس دور میں طب کی ایک ہی تو شمع فروزاں رہ گئی ہے۔ حکیم سینا دراصل ان ہارضع اطبا میں سے تھے جو فن کو اس کی بقا کے لئے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ فن زندہ تھا نہ خود آپ۔ پھر بعض نازک مزاج باکمال شعرا کی طرح وہ اپنے آپ کو ایک مقدس قومی امانت سمجھتے تھے ان کو عزت و آسائش کے ساتھ زندہ رکھنا قوم کا فرض تھا اور ان کا اپنا فرض صرف اتنا تھا کہ بس وہ پیدا ہو گئے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ حکیم صاحب اگر "بوعلی سینا" نہ ہوتے تو "میر تقی میر" ہوتے۔

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہر چند وہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے مگر مستقبل کی طرف سے مایوس ہرگز نہ تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس گلی میں بکری کا بچہ بھی گزر سکتا ہے یا نہیں، اس بات کا پختہ یقین تھا کہ قوم ایک دن ہاتھی گھوڑے لے کر ان کے دروازے پر پہنچے گی اور مرنے کے بعد ان کے جنازے پر خلق خدا کا ہجوم دیدنی ہوگا۔ انہوں نے بڑے تیقن کے ساتھ مجھ سے کہا تھا "میں اپنی کامیابی کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اس وقت تمہیں دیکھ رہا ہوں مجھے بس ایک معرکے کے مریض کا انتظار ہے!"

مجھے اعتراف ہے کہ میں حکیم صاحب سے اس پہلی ملاقات میں کافی متاثر ہوا تھا۔ ان کی مضبوط قوت ارادی حیرت انگیز تھی میں نے محسوس کیا کہ ملنے والا ترحم اور سراسیمگی کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ان کی شخصیت کا ایک گونہ اثر ضرور قبول کرتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی تاریخی قبرستان کے کھنڈروں میں ایک خاص عظمت و جبروت کا احساس ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد مختلف وقفوں میں حکیم صاحب سے میری تین چار ملاقاتیں اور ہوئیں۔ میرے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ سال میں بمشکل ایک مرتبہ اپنے آبائی شہر میں آنے کی مہلت ہے مگر جب کبھی موقع ملتا میں حکیم صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔

ایک مرتبہ اثنائے گفتگو میں میں نے جدید زمانہ کے تقاضوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروپیگنڈے کی اہمیت پر زور دینا چاہا تو حکیم صاحب اس طرح بھڑک اٹھے کہ ان کی عمر کا آدمی اس شدت سے بالعموم بھڑک بھی نہیں سکتا۔ غضبناک ہو کر بولے۔

"کیا کہا پروپیگنڈا؟"

"جی ہاں"

"جی نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ اب تم کہو گے کہ چوک میں جا کر مجمع بھی لگایا کروں؟ — صاحبزادہ صاحب! مشک آنست ...." اور پھر میز پر سے سفوف کی دو بوتلیں اٹھا کر باہر گلی کی بدرو میں پھینکتے ہوئے کہا "یہ لو آج میں نے انسانوں کی بدبختی پہ ایک اور مہر ثبت کر دی۔ اگر کسی کتے نے اس نالی میں سے ایک بوند بھی پی لی تو دیکھ لینا کہ وجع المفاصل اور عرق النسا کے امراض سے محفوظ ہو جائے گا، مگر انسانوں کے لئے ان امراض کی شفا اب دنیا سے اٹھ گئی۔ اٹھ گئی —" اور حکیم صاحب خود بھی اٹھ کر کرب کی ایک خوفناک کیفیت میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

مدت کے بعد پھر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تو میز کی پانچ بوتلوں میں سے تین ہی سلامت رہ گئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اس درمیان میں آپ صرع اور سرطان کے بیماروں کا بیڑا بھی غرق کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ ان کی امیدیں بڑی تیزی سے ایک ایسی مایوسی میں بدلتی جا رہی تھیں، جس میں انسانوں کے خلاف نفرت اور جذبہ انتقام کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ انہوں نے بیس برس کی بندھی ہوئی پگڑی کھول کر اس کی جگہ یہ عہد باندھ لیا تھا کہ اب میت ہی دہلیز سے باہر نکلے گی۔ ایک خدا ترس ہمسائے کی معرفت پرانی بوتلیں معجونوں کے مرتبان۔ ہاون دستے اور کھرلیں بیچ بیچ کر کھا رہے تھے۔ اپنا پلنگ موجود تھا مگر مہتبنی والی چارپائی غائب تھی۔ میں نے مزاج پرسی کی تو کہنے لگے۔

"اور تو کچھ نہیں، ہاں یہ صدمہ ضرور ہے شمس میاں کہ میں زندہ ہوں اور دنیا مرتی جا رہی ہے۔ مگر خیر۔ اللہ کے بھیجے ہوئے کتنے سچے رسول بھی بظاہر اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے"۔ اس

ملاقات میں یہ لطیفہ بھی ہوا کہ میرے بیٹھے بیٹھے خدا معلوم کہاں سے اور کیونکر ایک خاصی معقول وضع کا ایک مریض لنگڑاتا لنگڑاتا مطب میں آنکلا۔ میں خوش ہوا کہ شاید حکیم صاحب کی ساعتِ مراد آپہونچی مگر وہ تو اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔

"اب آئے ہو وجع المفاصل لے کر جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

"لیکن قبلہ۔" مریض بولا "میرا مرض ابھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہونے پایا۔"

"جی ہاں" میں نے بھی مداخلت کی۔

"جی نہیں۔" حکیم صاحب بولے۔ "بندہ نواز اس مرض کی شفا اب انسانوں کے مقدر ہی میں نہیں رہی۔ اب تو لوگوں کو وجع المفاصل سمیت ہی جینا پڑے گا (پھر مجھ سے مخاطب ہو کر) میاں! میرا خیال ہے کہ خط نسخ کو قی میں اس مضمون کا طغرا لکھوا کر بازار میں آویزاں کرا دوں؟"

مجھے معلوم تھا کہ حکیم صاحب اس دوا کی بوتل ہی توڑ چکے ہیں مگر اس خیال سے کہ آیا ہوا مریض ہاتھ سے نکلنے نہ پائے میں نے پھر گذارش کی۔

"لیکن قبلہ وہ دوا دوبارہ بھی تو بنائی جا سکتی ہے۔ جی ہاں۔"

"جی نہیں۔ وہ نسخہ مسلسل بارہ برس کی ریاضت چاہتا ہے اور وجع المفاصل کا مریض پانچ برس سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔"

یہ سنکر مریض کے پیر تلے کی زمین نکل گئی۔ پہلے اس نے کانسی کے پیالے میں صراحی سے پانی انڈیل کر پیا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ لنگڑاتا ہوا واپس ہو گیا لیکن ابھی اس کی ایک ہی ٹانگ دہلیز کے پار ہوگی کہ حکیم صاحب بولے:-

"شمس میاں مجھے اس شخص کی جاناں مرگی کا بڑا رنج ہوگا مگر کیا کر سکتا ہوں شمس میاں بخدا مجھے اس وقت کے تصور ہی سے ہول آتا ہے جب لوگ پاگلوں کی طرح پکار پکار کر مجھے آوازیں دیں گے مگر حکیم سینا اس دنیا میں نہیں ہوگا۔"

حکیم صاحب سے میری آخری ملاقات دلچسپ ترین ملاقات ثابت ہوئی۔ مطب کی ویرانی پہلے سے سوا تھی۔ میز پر صرف سفید گولیوں والی ایک سرمئی بوتل رہ گئی تھی۔ پلنگ تک اٹھ چکا تھا مگر چہرے سے وہ گھٹاٹوپ مایوسی چھٹ چکی تھی۔ جتنی بشاشت اس مرتبہ میں نے ان کے چہرے پر دیکھی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مجھ سے تقریباً لپٹتے ہوئے بولے:-

"بھئی بڑے اچھے موقع پر آئے! آج میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ کرنے والا ہوں۔ زندگی کی سب سے بڑی کامرانی سے ہمکنار ہونے والا ہوں۔" (میز والی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "دیکھتے ہو یہ کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ بوتل ہے"

"جی نہیں۔ بوتل نہیں ہے۔ میری زندگی ہے۔ اس میں علم طب کا وہ راز بند ہے جو آج تک نہیں کھل سکا۔ بس آج ہی کھلے گا۔"

"خوب۔ بہت خوب!"

"حیرت سے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟۔ اس نسخے کے اجزا خود حضرت بوعلی سینا رحمتہ اللہ علیہ نے عالم رویا میں اس عاجز پر منکشف فرمائے تھے اور فرمایا تھا کہ اس میں بقراط و سقراط کی روحیں بند ہیں۔ چاند اور ستارے بند ہیں!"

"یعنی پھر تو واقعی بیحد عجیب چیز ہوئی"

"اور پھر حضرت نے فرمایا تھا کہ تمہاری زندگی میں فشار الدم کا ایک لاعلاج مریض آئے گا یہ گولیاں اس پر آزمانا"

"تو پھر آپ نے آزمائی؟" میں نے شوق کی بیتابی میں پوچھا۔

"کس پر آزماتا۔ تم پر؟"۔ وہ قدرے جھلا گئے مگر فوراً ہی دھیمے بھی ہو گئے "آج تو وہ موعودہ مریض پہونچا ہے جس کی بشارت آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے مجھے دی گئی تھی۔ اور ہاں۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کے بعد تجھ پر رزق۔ شہرت۔ عزت کے چالیس دروازے کھل جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں وہ مبارک ساعت آگئی ہے۔ مگر شمس میاں میں سوچتا ہوں کہ اگر مجھ پر اس طرح یکبارگی چالیس دروازے کھل گئے تو میں کس کس دروازے میں سے گذرا کروں گا؟"

اس کے بعد حکیم صاحب نے پورے تحمل کے ساتھ ساری روداد سنائی کہ فشار الدم کا ایک مایوس العلاج مریض کل اچانک ان کے ہاں آگیا تھا خود مریض کو تو کچھ معلوم نہیں کہ اسے کیا مرض ہے مگر حکیم صاحب کی تشخیص تھی کہ اسے فشار الدم ہی کا عارضہ تھا۔ آج وہ معالجے کے لئے مطب میں آنے والا تھا کیونکہ ان گولیوں کا تجربہ حکیم صاحب خود اپنے سامنے کرنا چاہتے تھے۔ گولیوں کے سلسلہ میں حکیم صاحب نے بتایا کہ بہت مدت ہوئی انہوں نے ایک ناگوری بیل پر دو گولیاں آزما کر دیکھی تھیں جس کا ردعمل خاطر خواہ نظر آیا تھا۔ بیل تو خیر ردعمل کے ضمن میں صرف اچھلتا کودتا ہی رہا لیکن حکیم صاحب کی رائے میں بیل کو دراصل بقراط اور جالینوس دکھائی دے رہے تھے۔ اس مرحلہ پر میں نے پوچھا کہ

آخر بقراط اور جالینوس کے نظر آ جانے سے مرض کیونکر دور ہو سکتا ہے تو اس کے جواب میں حکیم صاحب نے اقبال کا یہ مصرع پڑھ دیا کہ ؎

"نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سچ مچ مریض آ گیا جو بظاہر ہٹا کٹا گنوار سا دیہاتی نوجوان تھا۔ بات کی تو محسوس ہوا کہ فشار الدم کا مریض تو ہو یا نہ ہو ذہنی خلفشار کا مریض یقیناً تھا۔ بدحواس، پریشان خیال، پریشان وضع۔ بہرحال حکیم صاحب نے صوفے ہی پر اپنے پاس بٹھا کر کنوئیں کے آبِ تازہ کے ساتھ نقرئی ورق میں لپٹی ہوئی ایک گولی اس کے حوالہ کر دی جس کو حلق سے اتارنے کے بعد مریض فوراً بولا۔

"تلخی ہے۔"

"نہ تھوکیں اندر لیجئے!" حکیم صاحب ان سنی کر کے نبض تھام کر ردِعمل کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کچھ وقفہ کے بعد مریض سے پوچھا۔

"کیوں یہاں کیا کچھ محسوس ہو رہا ہے؟" جس کے جواب میں مریض نے دونوں آنکھیں بند کر کے گردن کو اس زور سے اپنی چھاتی پر پھینکا کہ اگر رگ پٹھے مضبوط نہ ہوتے تو کچھ عجب نہ تھا کہ گردن ٹوٹ کر باہر جا گرتی۔

حکیم صاحب بولے "اب ان پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ ناگوری بیل پر بھی اسی طرح پہلے غنودگی طاری ہوئی تھی۔ پھر مریض کو خواب آتا ہے۔ پھر بقراط۔ یا جالینوس۔ چاند۔ ستارے......" حکیم صاحب ردِعمل کے مختلف مراحل پر روشنی ڈال رہے تھے کہ ادھر مریض پر ردِعمل شروع بھی ہو گیا۔ ردِعمل کیا تھا اچھلنے کودنے کا ایک مضحکہ انگیز سلسلہ تھا۔ مریض صوفے سے اچھل کر میز پر جا بیٹھتا اور میز سے اچھل کر صوفے پر۔ حکیم صاحب جو نبض کو کسی حالت میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس ردِعمل میں برابر کے شریک تھے۔ کچھ دیر کی اچھل کود کے بعد بالآخر مریض بیہوش ہو کر میز پر اس طرح جا لیٹا جیسے عامل کے سامنے معمول پڑا رہتا ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے گرد و پیش پر یوں نظر ڈالی جیسے کوئی قلعہ سر کر لیا ہو۔

"لیجئے اب ردِعمل شروع ہوتا ہے۔"

"جی ہاں ——"

"جی نہیں —— ابھی کیا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔" ——

(اور پھر مریض پر جھکتے ہوئے)

"کیوں میاں؟"

"ارے کچھ بولو تو سہی۔"

"ہاں بھئی۔ کہو کوئی چیز نظر آئی؟"

"ہاں —— کچھ ہے تو سہی۔" مریض مری سی آواز میں بولا

"کیا ہے؟" حکیم صاحب فرطِ مسرت سے بچوں کی طرح اچھل کر بولے۔ "کیا چیز ہے۔ سورج۔ چاند۔ ستارہ۔ انسان ——"

"ابھی تو ایک لمبا سا کان ہی لٹک رہا ہے"

"الٰہی تیرا شکر! —— میاں میرا خیال ہے حکیم بقراط ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ کتابوں میں آیا ہے کہ حکیم بقراط کے کان غیر معمولی طویل تھے (مریض سے) ہاں تو کوئی اور چیز بھی دکھائی دی؟"

"جی ہاں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ بڑے بڑے دانت......"

"شاباش! —— یہ سمجھو تمہارا نصف مرض جا چکا —— دیکھا شمس میاں ان گولیوں کا طلسمی تصرف۔"

"جی ہاں" میں بولا۔

"جی نہیں" حکیم صاحب جی ہاں کو کم ہی برداشت کرتے تھے۔ "دیکھتے جاؤ۔ ابھی تو اس شخص کے کفِ دست پر شمس و قمر اترنے والے ہیں۔ بخدا اس وقت اگر یہ شخص چاہے تو پورے نظامِ شمسی کو ادھر سے اٹھا کر ادھر پھینک دے۔ (مریض سے مخاطب ہو کر) —— ہاں تو بھئی اور کچھ......"

"دم! —— لمبی دم ——" مریض یکبارگی چلایا۔ اس کی آواز میں خوشی کا جذبہ تھا۔ "دم؟" حکیم صاحب دم بخود ہو گئے۔ "دم! شاید کوئی دمدار ستارہ طلوع ہو رہا ہے" —— اتنے میں مریض پورے زور سے چلایا —— "نہیں —— بالکل نہیں —— ہمارا اپنا کمیدیا گدھا۔"

"گدھا؟ —— لاحول ولا قوۃ —— میرا خیال ہے مریض کو ایک اور گولی درکار ہے۔" حکیم صاحب میز پر سے بوتل اٹھا ہی رہے تھے کہ ناگاہ دو اجڈ سے دیہاتی مطب میں داخل ہوئے جن میں سے ایک نے آتے ہی زن سے ایک طمانچہ مریض کی کنپٹی پر جما دیا۔

"حرام خور کہیں کا —— کہاں بھیجا تھا اور کہاں آ کر لیٹا ہوا ہے —— اٹھ بے —— اٹھتا ہے یا ——" اور مریض اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب اور میں، دونوں ہکا بکا تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ لوگ ایک نواحی گاؤں کے کمہار تھے۔ کئی روز سے ان کا ایک گدھا کھو گیا ہے۔ "مریض" ان کا ایک نیم فاترالعقل بھتیجا تھا جو تین دن سے گدھے کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے سفید گولیوں والی وہ آخری بوتل بھی باہر نالی میں پھینک دی ٭

مشرقی بنگال میں تپِ دق کی روک تھام: بقیہ صفحہ ۴۲

اس کام کے لئے پاکستانی اسٹاف کو تربیت بھی دی گئی۔ اس مہم میں مقامی باشندوں کو تربیت دینے کا کام سب سے اہم سمجھا جاتا ہے کیونکہ جب تک نئے طریقوں اور آلات کے استعمال کرنے والے نہ ہوں، ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

عالمی ادارۂ صحت کے بین الاقوامی ماہروں کی ٹیم کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر ماریو ڈی مارکی اٹلی کے باشندے ہیں اور تپِ دق کے متعلق یورپ کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں مدت تک علاج معالجے کے تجربے حاصل کرچکے ہیں۔ ان کے ہمراہ تپِ دق کے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے مس ایلیشن نرس کے طور پر آئی تھیں۔ یہ برطانیہ کی رہنے والی ہیں، اور اپنے کام میں بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں۔ سنٹر میں ایکسرے کی مشین اور دوسرے آلات اقوام متحدہ کے بچوں کے امدادی فنڈ نے دئے تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے قریب ایک خوبصورت عمارت کہ جس میں یہ سنٹر قائم کیا گیا تھا مشرقی پاکستان کی حکومت کا عطیہ تھی۔ اس طرح اس منصوبے کو صحیح معنوں میں اقوام متحدہ کے فنی امداد کے پروگرام کا ایک کامیاب نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

ڈھاکہ سنٹر کا سب سے بڑا کارنامہ اس شہر کے باشندوں میں اس بات کا احساس پیدا کرنا ہے کہ تپِ دق کے خلاف سب شہریوں کو مل کر جد و جہد کرنی چاہیئے۔ اور اس جد و جہد کو کامیاب بنانے کے لئے ان کے اپنے شہر میں ایک ایسا مرکز قائم ہے کہ جہاں سے انہیں ہر قسم کی امداد مل سکتی ہے۔

ڈھاکہ کنٹرول سنٹر کی عمارت میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نظر ڈھاکہ شہر کے ایک بہت بڑے نقشے پر پڑتی ہے جو ایک بورڈ پر بنایا گیا ہے۔ اس نقشے پر محلوں، گلیوں اور کوچوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے موٹے موٹے پن لگے ہوئے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان مقامات تک ڈھاکہ سنٹر کے ہوم وزیٹر گھر گھر پہنچ چکے ہیں۔ یہ کام کیسے ہوتا ہے اس کی داستان اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہے۔ پاکستانی مردوں اور عورتوں کو ڈھاکہ سنٹر میں ۱۹۵۳ء میں اس کام کی تربیت دی گئی تھی۔ پہلے کورس کی کامیابی اس قدر ہمت افزا تھی کہ اسی سال ہوم وزیٹروں کی تربیت کا دوسرا کورس شروع کیا گیا، اور اس نصاب کی تکمیل بھی وقت پر ہوگئی۔ یہی ہوم وزیٹر اب ڈھاکہ شہر کے مختلف علاقوں میں گھر گھر جاکر تپِ دق کے مریضوں کو مشورے اور ہدایتیں دیتے ہیں۔

ڈھاکہ سنٹر میں ہر ہفتے سینکڑوں مریض پھیپھڑوں کا ایکسرے لینے کے لئے آتے ہیں۔ ایکسرے کی تصاویر کے بغیر تپِ دق کا علاج ناممکن ہے۔ اور اب تک مشینیں نہ ہونے کی وجہ سے صحیح طریقے سے علاج نہیں ہوسکتا تھا۔ اب بغیر کسی خرچ کے ایکسرے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شروع میں ایکسرے کی مشین پر کام کرنے کے لئے عالمی ادارۂ صحت کے ایک ماہر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اب یہ کام ایک پاکستانی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ اور تصویروں کو مکمل کرنے کے مختلف مرحلے بھی پاکستانی کاریگروں کے ہاتھ سے تکمیل پاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے فنی امداد کے پروگرام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایک منصوبے کی صورت میں شروع کیا جاتا ہے۔ اور اس منصوبے کو ابتدا میں غیر ملکی ماہر شروع کرتے ہیں۔ مگر ہر ہر قدم پر اس کی تکمیل میں مقامی ماہروں کو کام سکھایا جاتا ہے۔ تاکہ کچھ عرصے بعد جب یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو بین الاقوامی ماہر واپس چلے جائیں اور پورا کام مقامی باشندوں کے ہاتھ میں آجائے۔ یہی حال ڈھاکہ کے کنٹرول سنٹر کا ہے۔ ۲ سال تک اس کام کو سکھلانے کے بعد اب بین الاقوامی ماہر آہستہ آہستہ واپس جارہے ہیں اور ان کی جگہ وہ پاکستانی ماہر کام کررہے ہیں جنہیں اس منصوبے کے ماتحت خاص طور سے تربیت دی گئی تھی۔ اب صرف ڈاکٹر ڈی مارکی باقی رہ گئے ہیں لیکن ان کا تعلق بھی ڈھاکہ کنٹرول سنٹر کی نسبت ان دوسرے مرکزوں سے زیادہ ہے جو تمام مشرقی پاکستان میں تپِ دق کی روک تھام کے لئے بہت جلد کھولے جانے والے ہیں۔

۱۹۵۲ء میں وہ مرکز جو پہلی بار ڈھاکہ میں تجربہ کے طور پر قائم کیا گیا تھا آج تمام مشرقی ایشیا میں اپنی قسم کا بہترین ادارہ بن چکا ہے۔ اس تجربے کی روشنی میں ۱۹۵۵ء کے شروع میں اسی قسم کے تین اور مرکز مشرقی بنگال کے دوسرے ضلعوں میں کھولے جاچکے ہیں۔

ڈھاکہ شہر میں تپِ دق کے مریضوں کے لئے ایک بڑا ہسپتال تقریباً مکمل ہو چکا ہے جس میں دو سو مریض بیک وقت زیرِ علاج رہ سکیں گے۔ بہت جلد اسی قسم کے دو اور ہسپتال بھی جلد مکمل ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال میں آمد و رفت کے ذرائع میں ناؤ اور کشتی کو بہت بڑا دخل ہے۔ یہ تجویز بھی زیرِ غور ہے کہ تپِ دق کے گشتی ہسپتال کشتیوں میں قائم کئے جائیں تاکہ دور افتادہ قصبوں اور دیہات تک ان کی پہنچ ہو سکے۔ حال ہی میں عالمی ادارہ صحت نے فیصلہ کیا ہے کہ دوسرے ملکوں کے ڈاکٹروں کو تپ دق کی روک تھام کا کام سکھانے کے لئے ڈھاکہ کے سنٹر میں بھیجا جائے کیونکہ یہ اپنی قسم کا سب سے نیا اور کامیاب مرکز ہے۔

آج سے دو سال پہلے ۱۹۵۳ء کے حالات کا مقابلہ آج سے کیجئے تو حیرت ہوگی کہ جہاں تپ دق کے مریضوں کی دیکھ بھال کیلئے کوئی سامان نہیں تھا اب اسی جگہ تین ہسپتال زیرِ تعمیر ہیں یا مکمل ہو چکے ہیں؛ اور تمام صوبے میں اسی قسم کے چودہ مرکز کھولے جا رہے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے فنی امداد کے خاموش عملی کارناموں کی یہ ایک عمدہ مثال ہے ؛

تجلی: .... (بقیہ صفحہ ۲۲)

کہوں گا کہ یہ پہن لو اور ساری اتار دو ـــــ اور کونے میں جا کے چپ چاپ کھڑی ہو جاؤ ـــــ میں تمہاری تصویر کھینچے دیتا ہوں۔"

متحیر اور خوف زدہ گلنانی کے چہرے کا نقشہ مراد کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا ـــــ اس کے خوف زدہ بھاگنے کا انداز۔

"لیکن معاذاللہ، کیا ہی انوکھی جوانی ہے اس کے سارے بدن میں جھلکتی ہے۔ بات چیت میں بھی ذرہ برابر جھجک نہیں ـــــ تعجب ہے!"

اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ـــــ دبی آواز میں کہا؛ دروازہ کھولئے۔ مراد چونک پڑا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا؛ کون؟

مراد کے دروازہ کھولتے ہی گلنانی گھر کے اندر آگئی۔ احتیاط سے دروازہ بند کر دیا اور کہا: جلد چلئے میرے ساتھ ـــــ کپڑا لتا جو اور جیسا بھی ہے جلدی جلدی سمیٹ لیجئے۔ "مگر کیوں"؟ مراد نے پوچھا۔ سارے گاؤں کے لوگ آپ سے بگڑ گئے ہیں۔ کل وہ آپ کو مار ڈالیں گے۔

مارے خوف کے مراد کا سارا جسم سُن پڑ گیا۔ مگر اس نے کہا: میں پروا نہیں کرتا۔

"کیا مطلب؟

میں مرنے سے ڈرتا نہیں!

مرنے سے نہیں ڈرتے، مار سے تو ڈرنا چاہیئے۔

گلنانی ہنسنے کو تھی، مگر رُک گئی۔

مراد نے کہا: میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ خدا جانے اور کس مصیبت میں ڈال دو گی۔ تم ہی نے تو شکایت کر کے یہ فتنہ برپا کیا ہے۔

گلنانی نے کہا: میں نے تو کچھ نہیں کہا ـــــ آم کے پیڑ پر چھپ کے دو آدمیوں نے ہمیں دیکھا۔ انہوں نے جا کے سب سے کہہ دیا اور بہت سے جھوٹے الزام لگائے۔ خدا جانے کیا کیا کہا۔ یہ دیکھئے ماں نے مجھے کتنا مارا ہے۔

گلنانی نے مراد کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا، چلئے جلدی کیجئے۔ ناؤ گھاٹ پر لگی ہوئی ہے کسی نے بھانپ لیا تو پھر بچنا مشکل ہے۔

بارش میں گلنانی بالکل بھیگ گئی ہے۔ بھیگی ہوئی ساری اس کے بدن سے چمٹ گئی ہے، بری طرح لپٹی ہوئی ہے۔ گلنانی کو اس عالم میں دیکھ کر مراد کا دل بے اختیار ہو گیا۔

مراد نے کہا: تم چلو گی میرے ساتھ، گلنانی!

کہاں؟

کلکتے۔ میرے گھر۔

مجھے لے جا کے آپ کیا کریں گے؟ جانگیا پہنا کے تصویر کھینچیں گے؟

گلنانی دبی آواز میں کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

شادی کروں گا میں تجھ سے۔

آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟

نہیں۔ ایسا انوکھا حسن لے کے اس ذلیل گاؤں میں پڑی سڑتی رہو گی۔ یہاں کوئی تمہاری پوری طرح قدر نہیں کرے گا۔ مجھے کا بھی نہیں تمہاری اصلی قدر و قیمت۔

گلنانی مراد کی طرف نظر جمائے چند لمحے دیکھتی رہی پھر بولی۔ چلئے ناؤ میں گنجر اکیلا ہے۔

گنجر کون؟

عثمانی مسکرائی۔ نادؔ میں آئیے۔ دیکھتے لیجئے ہم بھی بھاگ رہے ہیں۔
میں اور گنجر۔
شہر کے کارخانے میں اسے نوکری مل گئی ہے۔ ہم دونوں وہیں گھر بنا کے رہیں گے۔ مراد احمقوں کی طرح دیکھتا رہا۔
دور ایک اور بجلی گری ؂

اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات :— (بقیہ صفحہ ۱۴)

بھنے کی پوری قوت تھی ظاہر ہے اس قدر طویل سلسلے کو ایک ہی سانس میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ راشد نے ایک بار پھر انگریزی کا سہارا لیا۔ اور وہاں کے کینٹو کی صورت میں اپنے خیالات کو پیش کرنے کا سامان کیا۔ کینٹو کا لفظ اطالوی ہے جس کے معانی گیت، نغمہ، گانا، دلکش موسیقی وغیرہ وغیرہ بہت کچھ ہیں۔ لیکن قدیم ایام سے جب شعر بیشتر گانے ہی کے لئے ہوتا تھا، کینٹو کا مفہوم طویل نظموں کے درمیانی وقفوں ہی کا تھا۔ انگریزی شاعری میں اکثر بڑے شعرا نے طویل نظمیں لکھی ہیں اور ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے ہر حصے کو ایک کینٹو کہا جاتا ہے۔ راشد نے بھی اپنی نظم "ایران میں اجنبی" کو تقریباً تیس حصوں میں تقسیم کرنے کا ڈھانچہ بنایا ہے۔ اس نظم کے بعض کینٹو چھپ چکے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول تو نظم آزاد کے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں، دوسرے ہر کینٹو میں مصرعوں کی تعداد مختلف ہے جو اسی سے لے کر چار سو سے اوپر تک پہنچتی ہے۔

"ایران میں اجنبی" ابھی ہمارے سامنے مکمل طور پر نہیں آئی تھی کہ ایک اور شاعر جعفر طاہر نے ایسے ہی کینٹو کی صورت میں ایک اور طویل نظم پیش کرنا شروع کی۔ یہ میر امن کے "قصہ چہار درویش" کے انداز پر مختلف درویشوں کی سیروں کا تذکرہ ہے۔ جو زمانۂ حال میں مختلف ملکوں کی تہذیب و معاشرت میں ہر لحظہ بدلتے ہوئے جدید رجحانات کو دیکھتے ہیں۔ اس نظم میں قدیم و جدید کی ایک دل نشیں آویزش ملتی ہے جو نہ جانے نظم کے ختم ہونے تک بالآخر کس نتیجے پر پہنچے گی۔ جعفر طاہر کی یہ نظم راشد کے برعکس پابند شاعری کا نمونہ ہے جس میں بندوں کی ساخت اور ان کے مصرعوں کی تعداد اکثر یکساں ہے۔ کینٹو کے میدان میں ابھی تک صرف یہی دو نامکمل نمونے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس لئے اس صنف کے بارے میں ابھی کوئی پیشگوئی کرنا قبل از وقت ہے۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جدید تقاضوں سے ہم آغوشی کے لئے اس قالب میں خاص جان ہے۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

شہیدِ ملت: ——— (بقیہ صفحہ ۱۶)

وزارت مرتب کرنے کے سلسلے میں مقیم تھے۔ اس سے چند دن پہلے راولپنڈی کی سازش کا واقعہ ہو چکا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اس سازش کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے قائدِ ملت سے کہا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ جب آپ کو یہ معلوم تھا کہ یہ سازش ہو رہی ہے تو آپ نے پورے صوبے کا دورہ کر کے جگہ جگہ جلسوں کو اس طرح کیوں خطاب کیا، جس میں آپ کی جان کا اندیشہ تھا؟ قائدِ ملت یہ سن کر مسکرانے لگے اور کہا کہ جب میں کراچی سے پنجاب کے دورہ پر روانہ ہوا تو ملتان پہونچنے پر مجھے سازش کی اطلاع مل گئی تھی۔ اگر کوئی اور ہوتا تو بیماری کا بہانہ کر کے کراچی لوٹ جاتا۔ کہنے لگے کہ لوگ کہتے ہیں مگر میرا تو یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، وہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے موت کے خوف سے اپنے کام کو بند کر دینا ضعف ایمان کی نشانی ہے۔ جب تک خدا کو مجھ سے پاکستان کی اور اس قوم کی خدمت لینی مقصود ہے وہ مجھے زندہ رکھے گا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جب میرا وقت آ جائے گا تو تمہاری یہ پولیس اور فوج مجھے موت کے ہاتھوں سے بچا سکتی ہے؟ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک سفاک نے ایسی ہستی کو ہم سے چھین لیا جس نے ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کی اور پاکستان کی بنیادوں کو ایک قلیل عرصے میں مضبوط بنایا۔ رخصت ہوتے وقت بھی مملکتِ پاکستان اور ملت کی ترقی اور سربلندی کی دعا ان کے لب پر تھی۔ وہ ہم سے رخصت ہو گئے، مگر ان کی محبت ہمارے دلوں پر نقش ہے۔ ان کا غم آج بھی تازہ ہے۔ قائدِ ملت آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کے زریں اصول، ان کا اعلیٰ عمل اور ان کا قابلِ تقلید کردار آج بھی ہمارے سامنے ہے اور ہر لحظہ ہماری رہنمائی کر رہا ہے:

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

23

اُردو کے غیر معروف ناول: (بقیہ صفحہ ۱۱)

تمہیں ہمراہ دیکھ کر بُرا مانتے اور شاید میرے معاملات میں کچھ مشکلیں پڑ جائیں بلکہ ممکن تھا کہ ناکامیابی ہوتی۔ وہاں کے اکثر لوگ مجھے اتنی بڑی جائداد کی وارثہ سمجھ کے امید موہوم سے خوشامد میں کام کریں گے۔ یقین ہے کہ بہت جلد کل جائداد نقد و جنس میرے قبضے میں آجائے۔ میرے اطلاع سے تین ماہ میں بالکل فرصت ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں دم بھر وہاں نہ ٹھہروں گی۔ اس درمیان میں تم کو خطوط لکھتی رہوں گی۔ اس میں شک نہیں کہ تم مجھے وفادار جانتے ہو، مگر مزید اطمینان کے لئے میں نے لکھنؤ کی کل جائداد کا بیع نامہ تمہارے نام کر دیا ہے۔ کاغذات ضروری میرے بکس میں موجود ہیں۔ جس وقت تم کو یہ خط ملے گا میں بمبئی سے بہت دور نکل گئی ہوں گی۔ تم آج ہی لکھنؤ چلے جاؤ۔ اور تین مہینے انتظار کرو۔ خدا وہ دن کرے گا کہ ہم تم دونوں باغ کے صحن میں شام کے وقت بیٹھے ہوں گے۔ گانا ہوتا ہوگا۔ تم اپنی غزلیں پڑھتے ہو گے میں سنتی ہوں گی۔ چند روز اور انتظار کرو۔ فقط۔

راقمہ،

تمہاری سوفیہ"

"مکرر یہ ہے کہ میرے باغ کو درست رکھنا۔ جرانیم کے درخت جو میں نے نئے لگائے ہیں ان کا مجھے بہت خیال ہے۔ مالی پر تاکید رکھنا۔"

اس خط کو دیکھ کر مرزا رسوا کے دل پر جو کچھ صدمہ گزرا گزرا مگر پھر دل کو تسکین دے کے لکھنؤ چلے آئے۔ ایک خط عدن سے آیا تھا۔ دو تین خط پیرس سے آئے تھے۔ ان میں مقامات کا مفصل حال تھا۔ اس کے بعد پیرس سے روانہ ہوتے وقت ایک تار دیا:۔

"ہم آج یوکوپیا نامی جہاز پر ہندوستان روانہ ہوتے ہیں"۔

تار کے آنے کے بعد دن کیسے، مرزا رسوا گھڑیاں گننے لگے۔ مگر وہ جہاز نہ آج آتا ہے نہ کل۔ مرزا رسوا کے دوستوں کا اور ہی کچھ خیال ہے مگر اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھنے والے سمجھ ہی لیں گے۔

روز سر شام تمام باغ میں چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ درختوں کی ایک ایک پتی دھوئی جاتی ہے۔ جابجا فانوس روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ صحن میں چبوترے پر دو کرسیاں بچھائی جاتی ہیں۔ جرانیم کے نانڈے گرد لگائے جاتے ہیں مرزا رسوا خود بیٹھتے ہیں۔ غزلوں کی بیاض سامنے رکھی جاتی ہے۔ ایک کرسی کے سامنے ارگن یا جالگا دیا جاتا ہے۔ نگاہیں دروازے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ آج تک اس معشوقۂ وفادار کا انتظار ہے۔ اس کو پندرہ برس ہو گئے۔ مگر ان کے جوش و خروش میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ دن بھر اچھے رہتے ہیں مگر شام کو اس جنون کا دورہ ہوتا ہے۔ دل قابو سے نکل جاتا ہے۔ خدا ان کے حال پر رحم کرے ؎

موت آجائے گی اک دن یہی کہتے کہتے
آج آتا ہے کہ کل آتا ہے کہیں سے کوئی

کشمکش: بقیہ صفحہ ۲۵

طرف اشارہ کر کے چلا رہی تھی۔ اللہ ڈنو کو کچھ نہ سوجھا۔ اندر جا کر وہ ٹین کے ڈبے اٹھا لایا۔ دونوں ان لکڑیوں سے بجانے لگے اور کھیتی کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ بے تحاشا بھاگے جا رہے تھے۔ ٹڈیوں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی تھی۔" ادھر دیکھنا۔ غضب ہو گیا" جنت پھر چیخی۔

ایک زبردست ٹڈی دل تا حد نگاہ آسمان پر پھیلا ہوا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یکایک دھوپ غائب ہو گئی اور ٹڈیوں کا سایہ چھا گیا۔ جہاں کہیں سبزی تھی اس پر ٹڈیاں ٹوٹی پڑتی تھیں۔ اللہ ڈنو نے کھیت کے چاروں کونوں پر آگ لگا دی۔ دونوں دیوانوں کی طرح ٹین کے ڈبے بجاتے اور ہاؤ ہو کرتے رہے۔ لیکن سب تدبیریں بے سود ثابت ہوئیں۔ بڑی بڑی ٹکڑیاں ٹڈی دل سے ہٹ کر شاداب فصل پر بیٹھنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری فصل پر ان کی چادر بچھ گئی۔ پودے، درخت، ہر جگہ جو سبز ہو ٹڈیوں سے پر تھی۔ اب بھی ان کا ایک سیلاب ہواؤں میں بہتا آگے بڑھ رہا تھا۔ جنت کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اللہ ڈنو خاموش تھا۔ دونوں گھنٹوں اپنی کھیتی برباد ہوتے دیکھا کئے۔ نہ اللہ ڈنو نے جنت کے نالہ و شیون کو روکنے کی کوشش کی اور نہ جنت نے اس سے غمگساری کی فکر کی۔ رات بھیگنے پر وہ اپنی جگہ آ گئے۔ کسی نے کچھ کھایا نہ پیا۔ جانوروں کا دودھ دوہنے کی کسے سدھ تھی۔ نگاہیں کھیت پر لگی تھیں اور دونوں اپنے خیال میں غرق تھے۔ جنت کبھی کبھی دبی آہ کے ساتھ کہہ اٹھتی "ہائے! ظلم ہو گیا"۔

"رونے رلانے سے فائدہ؟" اللہ ڈنو صبر کا پتلا بنا ہوا تھا۔ یہ سن کر جنت اور چلانے لگی۔ بہت دیر بعد دونوں کے ہوش ٹھکانے

ہوئے۔ شوہر نے بیوی سے کہا "دیکھو پو پھٹنے کو ہے۔ شبنم دیر سے گر رہی ہے۔ ٹڈیاں اڑ نہ سکیں گی۔ اب چل کر جتنی ہو سکیں پکڑ لیں ــ چند دن انہی پر گذرا ہو جائے گا۔"

جنت کچھ نہ بولی۔ اٹھ کر اندر سے چند بورے لے آئی۔ پانی بھر ایک بڑے برتن کو چولہے پر رکھ دیا۔ پانی میں نمک ملانے کے بعد بورے لے کر اپنے شوہر کے ساتھ ہولی۔ ٹڈیوں کے پر بھاری ہو چکے تھے۔ دونوں نے بورے اس طرح بھرے جیسے فصل پر باجرا۔ انہیں گرم پانی میں ڈال کر تھوڑی دیر بعد زمین پر پھینک دیتے۔ سورج نکلنے تک انہوں نے ٹڈیوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔ اللہ ڈتو کا دل چاہنے لگا کہ وہ ساری ٹڈیوں کو اسی طرح بھون ڈالے، لیکن وہ اپنی جھونپڑی کے آگے کی ساری ٹڈیاں بھی نہ مار سکا۔ پر سوکھنے کی دیر تھی کہ کھیت پر سے ٹڈیوں کا ایک جم غفیر اٹھا اور آندھی کی طرح آگے بڑھ گیا اور پیچھے ایک وسیع بھورا میدان چھوڑ گیا!

ان سب کا حاصل وہ چند بوریاں تھیں جو اب اونٹ پر لدی تھیں! یہ اونٹ بھی بچی کچی گھاس اور تمام جانوروں کے بدلے خریدا گیا تھا۔ جب بوروں پر نظر پڑی تو قسمت خالی نظر آئی لیکن جنت سامنے سے آ رہی تھی۔ بیوی نے اونٹ پر بیٹھنے کے لئے میاں سے اصرار کیا۔

"تم آرام سے بیٹھو۔ میں پیدل چلوں گا۔" اللہ ڈتو نے جواب دیا "لوگ کہتے ہیں آٹھویں ــ میں احتیاط بہت ضروری ہے۔"

وہ پھر شہر جا رہا تھا۔

آپنا گھر ـــــــ بقیہ صفحہ ۳۵

ــ کاش وہ لائبریری کے لئے گنجائش نکال سکتا۔" اس میں بڑی تبدیلیاں کرنی ہوں گی ابو۔" حامد نے باپ کو خاموش دیکھ کر کہا "ہم دونوں کے لئے نیچے ہی جگہ نکالئے نا۔ یہاں آپ اپنے لئے کمرہ بنوا سکتے ہیں۔ دوسری منزل کی خوابگاہ جہاں خانہ بن سکتی ہے یہ رضیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کا کمرہ بھی نچلی منزل ہی پر ہونا چاہئے۔ میرے کارخانے کیلئے تو آپ کو جگہ نکالنی ہی ہوگی۔ اب اس دادا جان والی کوٹھی میں دیکھئے کتنی آسانی سے انہوں نے میرے لئے جگہ نکالی تھی۔ رضیہ کی طرح دراصل ابو مجھے اپنے کمرے اور کارخانے سے بے حد محبت ہو گئی ہے۔ اب اگر ہم یہاں سے کہیں اور گئے اور وہ جگہ ایسی ہی نہ ہوئی تو ہمیں بہت دکھ ہوگا۔"

"اس کا مطلب یہ کہ یہ نقشہ بیکار ہو گیا۔ اس میں اب اتنی بہت سی تبدیلیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" شاہد نے سگریٹ ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ اب پھر ذکیہ اٹھی اور وہ بھی میز کے قریب پہنچ کر باپ اور بیٹے کے ساتھ نقشے کا جائزہ لینے لگی۔ ہاں واقعی ــ اس میں تبدیلیوں کی کوئی گنجائش نہیں کس قدر مکمل ہے یہ ــ اس نے سوچا اور یوں ہی غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں رضیہ تک گئیں جو بستر پر زرد زرد سی خاموش لیٹی باپ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی بیمار اور اداس لگ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ذکیہ کو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب مایوسی نظر آئی اور وہ بے چین ہو گئی۔ یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں گردوپیش کا جائزہ لیا اور پھر شاہد سے قریب ہو کر وہ آہستہ سے بولی، یوں جیسے آپ ہی آپ بڑبڑا رہی ہو۔

"آخر اس کوٹھی میں کیا خرابی ہے جو ہم نئی کوٹھی کی آرزو کر رہے ہیں؟ ــ حامد کا اچھا خاصا کارخانہ بھی ہے۔ اس سے ملحق باغیچہ بھی ہے۔ رضیہ کا کمرہ بھی اچھا ہے اور نچلی منزل پر ہے، ہوادار ہے، خوبصورت ہے، بڑا دریچہ بھی ہے جس میں سے سورج کی پہلی کرنیں اندر آتی ہیں۔ خود مجھے اپنی خوابگاہ بہت پسند ہے جو بچوں کے کمروں سے قریب ہے اور نچلی منزل پر ہے نئے نقشے میں تو ہماری خوابگاہ دوسری منزل پر ہے۔"

ذکیہ کی باتیں شاہد کو کچھ عجیب سی لگیں اور اس نے ذرا غور سے اپنی بیوی کو دیکھا اور یکایک ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔ یہاں لائبریری بھی تو ڈرائنگ روم سے علیحدہ ہی ہے!! دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں نے ایک ساتھ محسوس کیا جیسے آج پہلی بار انہیں اس کوٹھی کی خوبیاں معلوم ہوئی ہوں، جیسے پہلی بار وہ یہاں آئے ہوں اور اپنے اس گھر کو ڈھونڈ نکالا ہو، اس کے تمام راز پالئے ہوں ــــ ان کا یہ اپنا گھر جس میں پہلی بار ذکیہ دلہن بن کر آئی تھی، جہاں شادی کے بعد انہوں نے ابتدائی چند ہفتے ہنسی خوشی گذارے تھے، جہاں ان کے بچے پیدا ہوئے تھے، جہاں رضیہ نے ہوش سنبھالا تھا اور حامد نے بوڑھے دادا کے ساتھ بے شمار ہوائی جہاز بنائے تھے، جس کے خوبصورت باغیچے سے برسوں اس نے اپنے بچوں کے قہقہے، ان کی چیخ پکار سنی تھی ــــ یہ گھر جو، ان کی زندگی میں، ان کے ماضی اور اس کی بے شمار یادوں میں کچھ اس طرح رچ بس گیا تھا کہ اسے خیرباد کا خیال ہی کس قدر تکلیف دہ تھا۔ جو اینٹوں اور سیمنٹ کا ڈھانچہ نہیں تھا، بلکہ شاید ان کے عزیز ماضی نے اس گھر کا روپ کچھ اس طرح اختیار کر لیا تھا کہ اب وہ جب بھی ایک نئے گھر کا۔ "اپنے گھر" کا تصور کرتے، تو وہ کرنل واجد کی اس کوٹھی سے زیادہ مختلف نہ ہوتا۔

کمرہ میں سب خاموش تھے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، ایک دوسرے کی آنکھوں کا خاموش پیغام پڑھا اور پھر شاہد چپکے سے اٹھا اور اس نے نقشہ الماری میں بند کر دیا۔

اب یہ الماری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھی!

فوراً جھاگ دینے والا سن لائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اُجلے دھوتا ہے
اپنے کپڑوں کی احتیاط کیجئے اور اُن کو زیادہ پائیدار بنائیے۔ سن لائٹ کے مالامال جھاگ میں کپڑے دھوئیے۔ دھوتے وقت کپڑے پٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف جھاگ میں جلدی جلدی کپڑے ملئے اور دھو ڈالئے۔ اتنی کم محنت کے باوجود سن لائٹ میں دھلے ہوئے کپڑے بے حد سفید اور اُجلے ہوتے ہیں۔ خود محنت سے بچئے اور کپڑوں کو نقصان سے بچائیے۔ ہمیشہ سن لائٹ صابن سے کپڑے دھوئیے۔
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ صابن
کپڑا بچاتا ہے • محنت بچاتا ہے • پیسہ بچاتا ہے

تندرست و توانا۔
ڈالڈا سے پکے ہوئے
کھانے کی بدولت
اس کی ماں جب اپنے بچہ کو دیکھتی ہے تو
محسوس کرتی ہے کہ تندرست و توانا بچہ کتنا پیارا
ہوتا ہے۔ صحت مند ہنس مکھ اور کھانے کے وقت کبھی
چہرہ سے بے لطفی ظاہر نہیں ہوتی اسی لئے تو وہ ہمیشہ
کھانا ڈالڈا وناسپتی سے پکاتی ہے جو کہ خالص و صحت مند
ہوتا ہے اور کھانے کی لذت بڑھاتا ہے۔ اور پھر ڈالڈا
بیحد قوت بخش بھی تو ہوتا ہے۔ آج ہی ایک ہوابند مہر دار
ڈبہ خرید لیجئے۔
DALDA
VANASPATI
ڈالڈا
وناسپتی
डालडा
वनस्पति
صرف کھجور کے پیڑ کے
مارکے کا ڈبہ لیجئے۔
ڈالڈا بہتر کھانے کو بہترین بناتا ہے
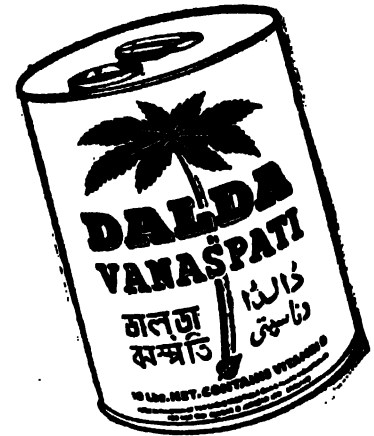
دِن بدِن
صاف اور حسین جلد
کیڈل * آمیز رکسونا
سے اپنے اصلی حسن کو
نکھرنے دیجیے
رکسونا کے کیڈل سے مالامال جھاگ کو اپنی جلد پر نرمی سے ملئے
اور پھر دھو ڈالئے پھر دیکھئے آپ کی جلد دن بدن نرم اور
ملائم ہوتی جائے گی جس سے آپ کا حسن درخشاں ہو جائے گا
رکسونا
* کیڈل آمیز واحد صابن
* جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے
RP.7-193UD
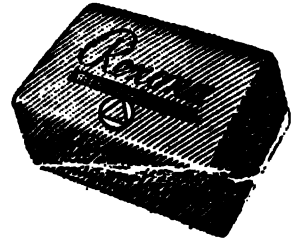
ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔ مدیر: رفیق خاور۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس مکلوڈ روڈ - کراچی

REGD. NO. S. 1086 ہماری مطبوعات MAH-I-NAU, KARACHI, OCTOBER, 1955.

ثقافت پاکستان

اگرچہ ہمارا ملک سیاسی طور پر ایک نوزائیدہ مملکت ہے لیکن ثقافتی اعتبار سے اس کی بنیادیں ماقبل تاریخ عہد کی گہرائیوں تک پہنچتی ہیں - فی الحقیقت پاکستان تہذیب، علم اور تمدن کا قدیم ترین گہوارہ ہے اور تقسیم ملک کے بعد اس بر صغیر کے بہترین تہذیبی ورثہ کا جزو اعظم پاکستان ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ " ثقافت پاکستان " ایک مبسوط کتاب ہے جس میں پاکستان کے ثقافتی ورثہ کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں ملک کے نامور مفکرین اور اہل قلم نے حصہ لیا ہے۔

دیدہ زیب مصور سرورق - مجلد پارچہ، طلائی لوح، ۱۶ تصویری صفحات، متن ساڑھے تین سو صفحات - قیمت ساڑھے چار روپے -

انتخاب کلام - مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مشرقی پاکستان کے مسلمان شعرائے بنگالی ادب میں جو بیش بہا اضافے کئے ہیں ان کا ایک مختصر مگر سیر حاصل انتخاب عہد قدیم سے لیکر معاصر شعراء تک پیش کیا گیا ہے، یہ ترجمے پروفیسر احسن احمد "اشک" اور یونس احمر نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں -

۲۰۰ صفحات - مجلد (پارچہ)، طلائی لوح، ساڑھے چار روپے - سادہ مجلد - چار روپے

عبداللہ

یہ بنگالی زبان کا ناول پہلی بار اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ ناول عبوری دور کے معاشرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس میں نئی زندگی پرانی زندگی کے ساتھ محو کشمکش ہے۔ اور آخر کار نئے تقاضے حیات کا رخ بدل دیتے ہیں -

ناول کا پس منظر بنگال کا ہے - مگر اس کی کہانی ہم سب کی اپنی کہانی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کا تاریخی ارتقا کس طرح ایک ہی نہج پر ہوا اور ہم ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں -

۴۰۰ صفحات - مجلد کتاب، دیدہ زیب سرورق، قیمت سادہ جلد چار روپے، طلائی جلد ساڑھے چار روپے -

مشرقی بنگال کا پوتھی ادب

مسلم بنگال کی عوامی زبان اور ادب اسلامی افکار و علوم سے مالا مال رہا ہے۔ مسلم ادبا و شعرا نے اس زبان کو دیوی دیوتاؤں کے تصور سے نجات دلا کر انسان اور زندگی کو اپنا موضوع بنایا اور اپنے تاثرات کو ایسے سانچے میں ڈھالا کہ ان کا ادب مذہب، تصوف، تاریخ، تمدن، روایات اور قومی داستانوں کا لا زوال سرچشمہ بن گیا - اسے پوتھی ادب کہتے ہیں - یہ کتاب مسلمانان بنگال کے اس ادب کا مکمل تعارف ہے اس کے ذریعے آپ بنگال کے مسلم عوام کی روح تک پہنچ سکتے ہیں - قیمت صرف ۱۲ آنے -

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی